عصرِ حاضر میں
دین کی تفہیم و تشریح
(مع اضافہ جدیدہ)
بعض معاصر تحریکوں اور تحریروں کے آئینہ میں
ایک جائزہ اور تبصرہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
مجلس نشریات اسلام
۱۔کے۔۳۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱
کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست عناوین

نذر و پیش کش ——— ۷
مقدمہ طبع دوم ——— ۱۰
پیش لفظ ——— ۱۳
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ——— ۳۱
کیا قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں صدیوں تک پردۂ خفا میں اور اسلام کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور رہی؟ ——— ۳۱
امت کی صلاحیت اخذ و فہم اور قرآن کی خصوصیت "ابانت" وافادیت ——— ۳۳
الفاظ و معنی کا رشتہ ——— ۳۴
قرآن کی بنیادی صفات و خصوصیات ——— ۳۶
امت مسلمہ کلی طور پر کسی دور میں جہالت عامہ و ضلالت مطلقہ میں مبتلا نہیں ہوئی ——— ۴۱
عقل سلیم کی شہادت ——— ۴۲
ایک مصری فاضل اور اخوان کے مرشد عام کا تبصرہ و تنقید ——— ۴۳
عالم اسلام و تاریخ اسلام کی تاریک تصویر ——— ۴۷
اہل حق کی موجودگی اور احادیث صحیحہ میں غلبۂ حق کی مساعی کے تسلسل و دوام کی پیشین گوئی ——— ۵۳

تاریخ اسلام میں اصلاح و تجدید کی کوششوں کا تسلسل ۔۔۔۔۔ ۵۴
سلبی و منفی طرز فکر کا نفسیاتی اثر ۔۔۔۔۔ ۵۶
حاکمیت "الٰہ و رب" پر انحصار ۔۔۔۔۔ ۵۷
سید قطب کی ملتی جلتی تصریحات ۔۔۔۔۔ ۶۰
ایک غلو اور اس کی تردید ۔۔۔۔۔ ۶۶
کیا انسان اور خدا کا تعلق محض حاکم اور محکوم کا ہے؟ ۔۔۔۔۔ ۶۸
اسماء و صفات و افعال الٰہی کا تقاضہ و مطالبہ ۔۔۔۔۔ ۷۰
عبودیت و الٰہ کی تعریف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے یہاں ۔۔۔۔۔ ۷۱
انبیاء علیہم السلام کی بعثت و تعلیم کا اصل مقصد توحید کی دعوت اور شرک کا استیصال ہے۔ ۷۴
اسوۂ انبیاء و مزاج نبوت ۔۔۔۔۔ ۷۸
جواں ہیں لات و منات ۔۔۔۔۔ ۸۱
انبیاء کرام کے جہاد و جد و جہد کا اصل موضوع و نشانہ ۔۔۔۔۔ ۸۳
شرک جلی اور سیاسی اطاعت و حکومت میں فرق ضروری ہے ۔۔۔۔۔ ۸۴
ربوبیت و الوہیت کی اصل روح اقتدار اور حاکمیت مان لینے کے بعد عبادات کی حیثیت ۔۔۔۔۔ ۸۵
قرآن مجید میں اعمال عبادت کی کثرت کی تعریف و ترغیب ۔۔۔۔۔ ۸۸
رب و الٰہ کی محض حاکمیت و اقتدار کے عقیدہ کا نفسیاتی اثر ۔۔۔۔۔ ۹۱
کیا اسلامی عبادات و ارکان اربعہ محض وسائل و ذرائع ہیں؟ ۔۔۔۔۔ ۹۳
قرآن کا بیان اور اس کی ترتیب ۔۔۔۔۔ ۹۴
اسوۂ رسول اور ذوق نبوی کی شہادت ۔۔۔۔۔ ۹۵

عبادات وارکان کو وسائل ماننے کا نفسیاتی اثر ـــــــــ ۹۷
تعطل و بطالت اور زندگی سے فرار کا مفروضہ ـــــــــ ۱۰۰
تاریخ جہاد و عزیمت سے دو مثالیں ـــــــــ ۱۰۱
کیا حضرات شہیدین کی جدوجہد "اقامت دین" کی کوشش نہیں تھی؟ ـــــــــ ۱۰۳
کچھ ہوئے تو یہی مردان قدح خوار ہوئے! ـــــــــ ۱۰۵
تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ـــــــــ ۱۰۷
فریضۂ اقامت دین، شریعت و تاریخ کی روشنی میں ـــــــــ ۱۰۷
اقامت دین، حکمت دین کے ساتھ ـــــــــ ۱۱۹
آخری گذارش ـــــــــ ۱۲۵

عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح

"پیش نظر کتاب ایک علمی و اصولی تبصرہ و جائزہ ہے، وہ نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، نہ فقہ و فتاوی کی زبان میں، وہ ایک اندیشہ کا اظہار ہے اور "الدین النصیحۃ" (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے حکم پر عمل کرنے کی مخلصانہ کوشش، اس کی کوئی سیاسی غرض ہے نہ کوئی جماعتی مقصد...... اس ناخوشگوار کام کو محض عند اللہ مسئولیت و شہادتِ حق کے خیال سے انجام دیا گیا ہے، جو لوگ دین کی سنجیدہ اور مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہیں، ان میں طلبِ حق کی سچی جستجو اور اپنی دینی ترقی و تکمیل کا جذبۂ صادق پایا جاتا ہے، انھوں نے ہمیشہ صحت مند اور تعمیری تنقید اور مخلصانہ مشورہ کی قدر کی ہے، اور فکرِ وسعیِ اسلامی کی طویل تاریخ میں دین کے صحیح فہم و تفہیم اور اسلام کی صیانت و حفاظت میں اس سے ہمیشہ مدد لی گئی ہے۔"

(مستفاد از مقدمۂ کتاب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نذر و پیش کش

یہ کتاب ہر اس عزیز دوست کی خدمت میں تحفہ اور نذر ہے جس کا عقیدہ ہے کہ ہر حال میں رضائے الٰہی کا حصول، زندگی میں کتاب و سنت پر عمل اور آخرت میں جنت کی یافت اور جہنم سے نجات ہی مقصود اصلی ہے، اس کے سوا ہر طرح کی دینی جدوجہد (مسلم) جماعتوں اور قیادتوں کی تشکیل، نظام معاشرت اور حکومتوں کی اصلاح کی کوشش محض ذرائع و وسائل ہیں، جو اِس مقصد کے حصول اور اسلام کی ترقی و سربلندی کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں، اس لئے شخصیتوں سے اس کی محبت و وابستگی محض اللہ کے لئے ہوتی ہے، اور تحریکوں اور تنظیموں کے کام میں اس کی دلچسپی و سرگرمی محض دینی حمیت و حمایت (نہ کہ جاہلی و گروہی عصبیت) پر مبنی ہوتی ہے۔

یہ کتاب ہر اس شخص کے پیش خدمت ہے جس کا ایمان ہے کہ خدا کی نعمتوں میں سے (جو وہ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے) ایک ہی مخصوص نعمت ہے، جو ایک برگزیدہ ہستی پر ختم ہوئی ہے، وہ "نبوت" کی نعمت ہے، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ختم ہوگئی۔ باقی دوسری تمام نعمتیں باقی اور جاری و ساری

ہیں، جیسے علمی تبحر کی نعمت، ذہنِ سلیم و فکر رسا کی نعمت، صحت و وسعت تحقیق کی نعمت، ان میں سے کسی پر کسی کی اجارہ داری نہیں، اور نہ وہ کسی انسان پر ختم ہو چکی ہے، "وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔"

یہ کتاب ان لوگوں کی خدمت میں ہدیہ ہے جو "خوب سے خوب تر" "زیبا سے زیبا تر" کی تلاش میں رہتے ہیں، اور ان کو بہتر چیز کے حاصل کرنے اور ایضاح حق اور اتمام حجت کے بعد اس کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک فرمان میں ارشاد فرمایا کہ "اصل حق ہے، کسی وقت بھی اس کی طرف رجوع کر لینا نہ شرم کی بات ہے نہ کوئی انوکھا اور نرالا کام۔"

یہ کتاب ایسے لوگوں کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ نقد و احتساب کا حق ایک مشترک حق ہے، جس سے ہر ایک کام لے سکتا ہے، اور اس سے کسی صاحب علم و نظر کو محروم نہیں کیا جا سکتا، صحتمند تنقید اور منصفانہ اظہار خیال پر بلدیہ کا بے لچک قانون (ONE WAY TRAFFIC) "سواریاں صرف جائیں آئیں نہیں" لاگو نہیں ہو سکتا۔

یہ کتاب ایسے حضرات کی خدمت میں پیش ہے جو کسی کتاب پر اسے پوری طرح پڑھے اور سمجھے بغیر حکم نہیں لگاتے، اور نہ مصنف کی نیت پر حملہ اور اس کے مقصد کی طرف سے بدگمانی میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔

وصدق اللہ العظیم۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ	تو آپ بشارت دے دیجئے میرے
الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ	ان بندوں کو جو بات سنتے ہیں تو اس کے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ٥ (الزمر ۱۷، ۱۸)

اچھے پہلو کی اتباع کرتے ہیں، وہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور وہی لوگ عقل والے ہیں۔

ابوالحسن علی

مقدمہ طبع دوم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم

پیش نظر کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" جیسا کہ اس کے طبع اول کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے، رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ اگست ۱۹۷۵ء میں لکھی گئی تھی، وہ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ اور اکتوبر ۱۹۷۵ء میں چھپ کر باہر آئی اور اپنے موضوع کی اہمیت کی وجہ سے بہت جلد ملک میں پھیل گئی، مصنف نے کچھ عرصہ کے بعد (جب اس کے عرب دوستوں نے عربی میں اس کی اشاعت کی ضرورت کا اظہار کیا) اس کے ترجمہ کا کام رفیق عزیز مولوی نور عالم صاحب امینی ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کے سپرد کر دیا جو عربی کے اچھے مترجم اور رسالہ "البعث الاسلامی" اور "الرائد" کے مستقل مضمون نگار ہیں، انھوں نے اس خدمت کو بڑی خوبی اور لیاقت سے انجام دیا، مصنف نے جب اس ترجمہ کو دیکھنا شروع کیا تو اپنی عادت کے مطابق اس میں جابجا اضافے کئے، یہ اضافے سب سے زیادہ پیش لفظ میں تھے۔

ان اضافوں کی ضرورت کا احساس ان خطوط کے پڑھنے کے بعد خصوصیت کے ساتھ ہوا جو جماعت اسلامی (ہندوستان) کے حلقہ کے زیادہ تر رفقاء و متفقین اور کم تر ارکان اور ذمہ داروں کی طرف سے مصنف کو موصول ہوئے، جن میں اس کتاب پر جذباتی انداز

میں شدید ردِ عمل کا اظہار کیا گیا تھا، اور بعض خطوط میں مصنف کی نیت پر ذاتی حملے بھی تھے،
ان خطوط کے مطالعہ نے بعض ایسے نقاط کی مزید وضاحت اور ان کو تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت
پیدا کر دی جو کتاب کے اردو ایڈیشن کے پیش لفظ میں اجمالی اور سرسری طریقہ پر پیش کئے گئے تھے،
مصنف کو اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اس متوازن و محتاط تنقید پر جو خالص علمی اور فکری انداز
میں ہے اتنی ناگواری کا اظہار کیا جائے گا، اور اس کے خلاف اتنا شدید ردِ عمل ہوگا۔

مصنف نے کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد اس کا ایک نسخہ اپنے ذاتی خط کے ساتھ
مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی خدمت میں روانہ کیا تھا، اس کی وصولیابی پر مولانا کا ـــــ
۲۳ جنوری ۸۰ء کا لکھا ہوا جو خط آیا وہ ہر طرح ان کے مقام و مزاج کے شایان شان تھا
اس میں انھوں نے صاف لکھا تھا کہ "میں نے کبھی اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا
نہ میں اس پر بُرا مانتا ہوں" مولانا نے اپنی دوسری کتابوں اور تحریروں کو بھی اسی نظر
سے دیکھنے اور اپنے "تاثرات اور خدشات" ظاہر کرنے کی دعوت دی۔

ردِ عمل کے اس تجربہ کے بعد جب کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی تو مصنف کو
مناسب معلوم ہوا کہ وہ اجزاء بھی شامل کر دیئے جائیں جو عربی ترجمہ کی خصوصیت ہیں، اس طرح
کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن زیادہ مکمل، زیادہ واضح اور زیادہ مفید ہو گیا، امید ہے کہ پہلے
ایڈیشن کا تجربہ سمجھ کر اس کا مطالعہ نظر انداز نہیں کیا جائے گا، اور جو لوگ کتاب کو اس کے پہلے
ایڈیشن کی صورت میں پڑھ چکے ہیں، وہ اس کے دوبارہ مطالعہ کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

مصنف کو اس کی بڑی مسرت ہے، اور وہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ یہ کتاب
بانی جماعت و تحریک مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی زندگی میں شائع ہو گئی، اور خود ان کی
بھی اس پر نظر پڑ گئی، اگر خدا نخواستہ اس کتاب کی اشاعت سے پیشتر ان کی وفات کا

حادثہ پیش آتا تو مصنف کو اس کتاب کی جلد اشاعت میں سخت تامل ہوتا، اور اگر اس کی اشاعت کی نوبت آجاتی تو لوگوں کو بدگمانی اور ناراضگی کا زیادہ موقع تھا، اور کتاب سے وہ فائدہ بھی نہ پہونچتا جو (کسی مختصر و محدود پیمانے میں سہی) پہونچا، یہ ایک قدرتی اور جذباتی بات تھی جس کی تردید یا اصلاح منطقی و علمی دلائل سے نہیں کی جا سکتی۔

جہاں تک مولانا مرحوم کی خدمات اور ان کی خصوصیات و کمالات کا تعلق ہے اس میں نہ پہلے شک تھا نہ اب ہے، مصنف نے ہر موقع پر اس کا پوری فراخ دلی بلکہ مسرت و شادمانی کے ساتھ اعتراف کیا ہے اور اس پر اپنے اس مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جو ان کی وفات کے ۳-۴ ہی دن بعد رسالہ "تعمیر حیات" کے لئے لکھا گیا، اور اس کی تازہ کتاب "پرانے چراغ حصہ دوم" کا ایک جزء ہے، البتہ مولانا کی وفات پر جماعت سے تعلق رکھنے والے اہل قلم کے جو مضامین اور جماعت کے رسائل و اخبارات کے جو خصوصی شمارے سامنے آئے ان کو پڑھ کر شخصیت پرستی کے خلاف مصلحین کی کوششوں اور خود مولانا نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا اس کی بے اثری و ناکامی کو دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی اور یہ عقیدہ اور مستحکم ہوا کہ کسی جماعت کا (جس کی بنیاد ایک ہی شخص کی تحریروں اور خیالات پر رکھی گئی ہو) عصبیت اور اپنے بانی کے بارے میں تقدیس کی حد تک غلو و مبالغہ سے محفوظ رہنا دشوار ترین کام ہے۔

عربی ایڈیشن کی اشاعت کے وقت "اہداء" کے عنوان سے ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا تھا جو اس اردو ایڈیشن میں "نذر و پیشکش" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے، خدا سے دعا ہے کہ جس خلوص نیت اور جذبہ کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے اسی خلوص و جذبہ کے ساتھ اس کتاب کے پڑھنے کی کوشش کی جائیگی۔ واللہ الموفق والمعین۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۱۰ ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ
۳ اکتوبر ۱۹۷۹ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

اسلام اللہ کا آخری دین ہے جس پر قیامت تک کے لئے انسانوں کی نجات اور ہدایت منحصر ہے، اور جس کو ان کی دینی و دنیوی رہنمائی کے لئے قیامت تک باقی رہنا ہے، اس کے عقائد و حقائق ناقابل تغیر و تبدل اور اس کی تعلیمات و احکام ناقابل تنسیخ و ترمیم ہیں، اس کی نہ صرف شریعت (مُنزل مِنَ اللہ ہے) بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کی بھی "حقائق ابدی" پر اساس ہے، لیکن جہاں یہ ایک واقعہ ہے، وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی حرکت و نمو اور تغیر و تبدل سے معمور ہے، اور یہ اس کی خرابی نہیں بلکہ خوبی ہے، فطرت سے انحراف نہیں بلکہ عین فطرت ہے، وہ اپنے لباس بدلتی رہتی ہے، انسانی نسلوں کی زبانیں اور طرز ادا، سوچنے کا طریقہ، ان کے اندر بے اطمینانی پیدا ہونے کے وجوہ و اسباب اور ان کے رفع کرنے کے ذرائع و وسائل، ان کے اندرون سے اٹھنے والے سوالات اور ان کو مطمئن کر سکنے والے جوابات سب بدلتے رہتے ہیں۔

دین کی اس ابدیت و قطعیت، اور زندگی کی اس تغیر پذیری اور ناپائداری کی متضاد کیفیت میں دین ابدی کے وفاداروں اور خدمت گذاروں اور اس کے ترجمانوں اور شارحین کا فرض یہی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانہ میں اللہ کے دین کی تفہیم و تشریح اس طرح کریں کہ ان ابدی و قدیم عقائد و حقائق پر نئی نسل کے قلوب میں نیا ایمان اور اس کے دماغوں میں نیا اذعان و

اطمینان پیدا ہو اور یہی مقصود ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس حکیمانہ مقولہ کا کہ :-

کلموا الناس علی قدر عقولھم	اہل زمانہ سے ان کی ذہنی سطح اور عقلی استعداد
أتریدون أن یکذب اللہ ورسولہ[۱]	کے مطابق گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کر (تمہاری اس گفتگو سے جو ان کے ذہن و عقل سے بالاتر ہو) وہ اللہ اور اس کے رسول (کی باتوں) کو جھٹلانے لگیں۔

اور یہی فرض ہر زمانہ کے متکلمین اسلام، اپنے وقت کے جلیل القدر حکما، و عارفین نے انجام دیا، اس سلسلہ میں (بلا کسی استقصار و استیعاب کے) امام ابو الحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی، حجۃ الاسلام غزالی، امام فخر الدین رازی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، عارف رومی مولانا جلال الدین قونوی، حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام لئے جا سکتے ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت اور حالات کے مطابق مختلف اسالیب میں یہ خدمت انجام دی، جزاھم اللہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

لیکن یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل اور نازک بھی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس ساری تفہیم و تشریح، ترجمانی و تعبیر، دینی حقائق کی تقریب و تسہیل اور ان کی تصویر و تمثیل میں اس احتیاط اور اس دقتِ نظر سے کام لیا جائے کہ اس سے اس نئی نسل یا طبقہ کا جس کو ان عقائد و حقائق سے مانوس یا ان کا قائل و حلقہ بگوش بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور جس سے اسلام کے فروغ یا اقامت دین کے لئے کام لیا جانے والا ہے، دینی مزاج اس دینی مزاج سے

---

[۱] صحیح بخاری میں حضرت علی کے الفاظ اس طرح منقول ہیں "حدثوا الناس بما یعرفون أتحبون أن یکذب اللہ ورسولہ" حضرت عبداللہ بن مسعود سے اسی سے ملتے جلتے الفاظ نقل کئے گئے ہیں (ملاحظہ ہو فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۲۶)

مختلف نہ ہونے پائے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت و صحبت سے صحابہ کرام کا بنا تھا، اور پھر یہ مزاج بعد کی نسلوں تک منتقل ہوا، اسی طرح ان کی فکر و سعی کی گاڑی اس پٹری کو چھوڑ کر جس پر نبوت نے اس کو ڈالا تھا، دوسری پٹری پر نہ پڑنے پائے، جیسا کہ ادیان و مذاہب اور فرق اسلامیہ کی تاریخ میں پیش آیا، یہ حادثہ ادیان و فرق کی تاریخ میں ایک ہی بار پیش آتا ہے لیکن اس تبدیلی کے ایک بار پیش آنے کے بعد پھر اس کی تلافی نہیں ہو سکتی، مذاہب و فرق کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے، صحیح دینی مزاج اس قوتِ قدسیہ اور تائید من اللہ کا نتیجہ ہوتا ہے، جو نبوت کو عطا ہوتی ہے، یہ اس امت کی سب سے بڑی طاقت، سب سے عظیم دولت، اور سب سے زیادہ قابلِ حفاظت میراث ہے، یہ مزاج بگاڑا تو جا سکتا ہے لیکن نبوت کی صحیح تعلیمات، علوم نبوت کی صحیح رہنمائی اور ربانی سیرت و دعوت اور موثر صحبت و تربیت کے بغیر بنایا نہیں جا سکتا، اس مزاج اسلامی کے زوال یا انحراف کی تلافی بڑی سے بڑی حکومتیں، سیاسی طاقت اور تنظیم نہیں کر سکتی۔

ہر عہد میں دین کی تفہیم و تشریح کا عظیم اور نازک کام جس طرح انجام دیا گیا، اس سے مسلمانوں کی اس نسل اور اسلامی عقائد و حقائق اور اقدار و مفاہیم کے درمیان وہ وسیع و عمیق خلیج واقع نہیں ہونے پائی جو یہودیت و عیسائیت کی تاریخ میں عہد عتیق اور عہد جدید کی تعلیمات و حقائق، اور یہودی و مسیحی دنیا کے تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کے درمیان بار بار واقع ہوتی رہی، اور اس نے اولاً بائبل کی تعلیمات کی طرف سے اس نسل کو بے اطمینانی پر آمادہ، پھر بغاوت پر کمربستہ کر دیا، اور ان دونوں قدیم مذاہب کے حلقہ میں الحاد و لادینیت نے وسیع پیمانہ پر سر اٹھایا جس کا نتیجہ آج پوری دنیا بھگت رہی ہے، اسلامی تاریخ میں عصر حاضر کے مطابق دین کی تفہیم و تشریح کا کام کرنے والوں نے اس کی نوبت نہیں آنے دی، اور اس امت کا ذہنی و فکری رشتہ اسلامی عقائد و حقائق اور اقدار و تصورات سے ٹوٹنے نہیں پایا بلکہ ہر زمانہ میں مستحکم و

استوار ہوتا رہا اور اس طرح اس امت کا یہ حال کبھی نہیں ہوا کہ (وہ ہندوؤں یا پارسیوں کی طرح) مذہبی و معاشرتی روایات کو تو دانتوں سے پکڑے رہے لیکن مذہب کی علم و عقل کے ساتھ مطابقت اور زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت کی طرف سے مشکوک بلکہ مایوس ہو اور وہ اپنے دین کی خیریت و سلامتی اسی میں سمجھتی ہو کہ علم کی تیز روشنی اس پر نہ پڑنے پائے، اور جہالت اور وہم پرستی کے جو دبیز پردے اس پر پڑے ہوئے ہیں، وہ بدستور پڑے رہیں، اس طرح شریعت اسلامی کے یہ ترجمان و شارح امت کے بڑے سے بڑے شکریہ اور اس کی دعاؤں اور قدر و اعتراف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس امت کو دین و علم کی رقابت اور ان دونوں کی اس خونریز کشمکش اور نبرد آزمائی سے بچا لیا جو قرون وسطی میں مغربی مسیحی دنیا میں پوری شدت کے ساتھ پیش آئی اور جس کے لئے مشہور امریکی فاضل ڈریپر (JOHN WILLIAM DRAPPER) کو اپنی شہرۂ آفاق کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" (CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE) لکھنی پڑی۔

عصر حاضر کے مطابق دین کی تفہیم و تشریح کا یہ ضروری، مفید اور مبارک کام جاری رہا، اور خدا ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق ایسے متکلم اسلام اور ایسے شارح دین اور ترجمان شریعت پیدا کرتا رہا جنھوں نے پوری کامیابی اور خوش اسلوبی سے یہ فرض انجام دیا، لیکن اسی کے ساتھ ان لوگوں سے بھی کوئی زمانہ خالی نہیں رہا، جن کو رسوخ فی العلم کی دولت حاصل تھی، اور جو ایک طرف اس دین و شریعت کے کامل مزاج داں، دوسری طرف نئی نسل کے صحیح نباض بھی تھے، انھوں نے اسلام کی اس عصری تفہیم و تشریح پر ناقدانہ نظر رکھی اور دیکھتے رہے کہ وہ اس صراطِ مستقیم سے انحراف تو نہیں کر رہی ہے، جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس امت کو چھوڑا تھا، اور اس سے دین کے فہم کا جو سانچہ اور دینی مزاج کا جو ڈھانچہ بن رہا ہے، وہ اس

دینی فہم اور دینی مزاج سے تو مختلف نہیں ہے، جو قیامت تک کے لئے مثالی اور معیاری رہے گا، انھوں نے اس کام کی پوری قدر کرتے ہوئے اور کام کرنے والوں کی نیت پر شبہہ کئے بغیر اس کے متعلق اپنی بے لاگ رائے ظاہر کی اور ان بے اعتدالیوں یا غلطیوں کی نشاندہی کی جو اس تفہیم و تشریح میں ان کو نظر آئیں، انھوں نے اس سلسلہ میں اسلام کی ترجمانی کرنے والے ان اہلِ علم اہلِ قلم اور اہلِ فکر کی شہرت و مقبولیت، ان کے بلند علمی مقام بلکہ بعض اوقات ان کے تقدس اور زہد و تقویٰ کی بھی رعایت نہیں کی، اور پورے خلوص، غیر جانبداری، اور توازن کے ساتھ اپنے خیالات و تأثرات یا اندیشوں اور خطرات کا اظہار کیا، دین کے ان شارحین اور شریعت کے ترجمانوں نے بھی (اکثر اوقات) ان مخلص ناقدین کے اس علمی و دینی "احتساب" کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا، ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا اور اپنے کام کو ان مشوروں کی روشنی میں زیادہ مفید اور زیادہ معتدل و متوازن بنا دیا، دین کے خادموں اور شریعت کے ان حامیوں کا سلسلہ ابتدائے عہدِ اسلام سے جاری رہا اور ایک حدیث صحیح کی پیشین گوئی کے مطابق قیامت تک جاری رہے گا، بیہقی کی روایت ہے کہ:۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ	اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل اور متقی
ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال	حامل و وارث ہوں گے جو اس دین سے
المبطلین وتاویل الجاھلین۔[1]	غلو پسند لوگوں کی تحریف اہلِ باطل کے
	غلط انتساب و دعویٰ اور جاہلوں کی
	دور از کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے

حقیقت میں ان دونوں گروہوں کی موجودگی ضروری ہے، اور انھیں دونوں کے تعاون و

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ثانی

اشتراکِ عمل میں دین کی حفاظت اور اس کے ذہنی و فکری تسلسل کا راز مضمر ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا سے مغرب کے بڑھتے ہوئے سیاسی اقتدار، اس کے نمایاں مادی تفوق اور سائنس و تجربی علوم کے میدان میں اس کی پے در پے فتوحات کے اثر سے عالم اسلام میں (جو کچھ عرصہ سے فکری اضمحلال اور سیاسی ضعف و انتشار کا شکار تھا) ایک ایسی ذہنی کشمکش برپا ہوئی[۱] کہ "عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم و تشریح" کا کام اگر پہلے مستحب کا درجہ رکھتا تھا تو اب کم سے کم فرض کفایہ بن گیا، تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بالخصوص جنھوں نے اس صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ کا سفر کیا یا ان کو انگریز حکام یا مغربی دانشوروں سے واسطہ پڑا، کچھ لوگ اسلامی عقائد کے بارے میں تزلزل میں پڑ گئے، بلکہ ان سے برگشتہ اور بیزار ہو گئے، اور بڑی تعداد ذہنی و تہذیبی ارتداد کا شکار ہوئی، اس وقت عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ایسے اہلِ قلم اور اہلِ علم میدان میں آگئے جنھوں نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، دین اسلام، شریعت اسلامی، اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کی تاریخ، ان کے نظام حکومت، اور نظام تعلیم کی طرف سے وکالت کا بیڑہ اٹھایا اور ترکی، مصر و شام اور ہندوستان میں ان فضلا نے اپنی اپنی مخصوص تعلیم و تربیت اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق یہ خدمت انجام دی، باوجود اس کے کہ یہ کام فائدہ سے خالی نہ تھا، اور اس نے بہت سی سعید روحوں کو اس ذہنی یا تہذیبی ارتداد سے بچا لیا جس کی تیز لہر عالم اسلام میں چل رہی تھی، یہ کوششیں عام طور پر دفاعی اور معذرتی انداز کی تھیں، ان میں اسلام اور مغربی تہذیب اور اس کے مسلمہ اقدار کے درمیان خلیج کو پاٹنے یا کم کرنے کی کوشش نمایاں تھی، مغرب

---

[۱] اس کے ارتقا اور مختلف ملکوں میں اس کے مختلف مدارج کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" ملاحظہ ہو۔

کی سیاسی واقتصادی اصطلاحات کو بھی بلا کسی تحفظ کے قبول کرنے اور ان کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ پر منطبق کرنے کا رجحان بھی پایا جاتا تھا، کہیں کہیں بعید از کار تاویلات بلکہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح کے نمونے بھی نظر آتے ہیں، جو ان کو مغرب کے مسلمہ حقائق کے زیادہ سے زیادہ مطابق ثابت کرسکیں، اس زمانہ کے راسخ فی العلم علماء نے اس کام کی جزوی قدر وقیمت کا اعتراف کرنے کے ساتھ ان کا علمی محاسبہ کیا اور جو مزاج قدرتی طور پر اس لٹریچر کے اثر سے بنتا تھا، اس کو ملت کا عام مزاج بننے سے روک دیا، اور بہت سے مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو اس سے متاثر ہو رہے تھے، صراطِ مستقیم پر لے آئے اور اس عالمگیر علمی تحریف کا اندیشہ جاتا رہا جو ان فضلاء کی ان تصنیفات و "تحقیقات" سے پیدا ہو گیا تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ٹھوس اور محتاط کام ہندوستان میں انجام پایا، جو براہِ راست برطانوی اقتدار کے ماتحت ہونے کی وجہ سے مغربیت و اسلامیت کی کشمکش کا سب سے بڑا میدان بن گیا تھا، اور جہاں دینی تعلیم و اسلامی تہذیب کے قدیم نظام نیز صوفیاء و مشائخ اور علماء ربانی کے اثر سے عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ میں وہ قوت مدافعت پائی جاتی تھی، جو دوسرے اسلامی و عرب ممالک میں (ان اثرات کے عرصہ سے مضمحل ہو جانے کی وجہ سے) مفقود یا بہت کمزور تھی، دوسری طرف ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کی ناکامی نے پھر بیسویں صدی کے ربع اول میں تحریک خلافت و ترکِ موالات نے اس حکومت اور قوم کے خلاف نفرت و کراہیت پیدا کر دی تھی، جو اس تہذیب، فکر اور فلسفۂ زندگی کی اس ملک میں نمائندہ اور علمبردار تھی، اس نے بھی مسلمانوں کو فکری الحاد اور تہذیبی ارتداد کے اس دھارے میں بہنے سے روکا جو یورپ سے آ رہا تھا۔

مغربی افکار و اقدار کی مقاومت کا یہ سلسلہ اپنے خاص رنگ میں چل رہا تھا کہ

اس صدی کے نصف اول میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے مؤقر رسالہ "ترجمان القرآن" (حیدرآباد) کے ان مضامین سے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہوں کو متوجہ کرلیا جو مغربی تہذیب اور فلسفۂ حیات کی تنقید و تردید میں "مدافعانہ" کے بجائے "جارحانہ" انداز میں لکھے گئے تھے، نیز مغربی تعلیم کے اثر سے پیدا ہونے والی تجدد کی تحریک اور ان خیالات کی تردید میں جو غالی قوم پرستی وغیرہ کی شکل میں پیدا ہو گئے تھے، تحریر کئے گئے تھے، اسی کے ساتھ انھوں نے شریعت اسلامی اور قوانین اسلامی کے ان مسائل و مباحث پر بھی مدلل و مؤثر مضامین لکھے جو تجدد پسندوں کا خاص طور پر نشانہ بنے ہوئے تھے، مثلاً سود، پردہ، جہاد، قربانی، غلامی، حدیث و سنت، عائلی قوانین وغیرہ، انھوں نے ان مضامین کے ذریعہ جو بعد میں علیحدہ مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئے، نیز متعدد مستقل تصانیف و رسائل کے ذریعہ جدید تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کا اسلام کے اقدار و افکار پر اعتماد بحال کرنے اور اس کو اسلام اور اس کی تعلیمات کے بارے میں احساس کہتری اور شکست خوردگی کی ذہنیت سے بچانے کا وہ مفید کام انجام دیا جس کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہے، اسی بنا پر اس وقت کے بعض اہل قلم نے ان کو "متکلم اسلام" کا خطاب دیا۔

اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر وہ اسی کام کو اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار کا میدان اور اپنی زندگی کا موضوع و مقصد بنا لیتے، لیکن انھوں نے اس کے ساتھ فکر اسلامی کی تشکیل جدید یا "الٰہیات اسلامیہ" کی تشکیل جدید کے طرز کا کام شروع کیا، اور اسی کو مسلمانوں کی نئی بیداری، تنظیم، اور جماعت اسلامی کی فکری اساس بنایا، میری مراد ان کی مشہور و مقبول کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" سے ہے، جس میں انھوں نے قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں کی تشریح کی جن پر اسلام کا پورا محور گردش کرتا ہے، اور جن کے بغیر نہ اسلام پر صحیح عمل ہو سکتا ہے، نہ اس کی دعوت دی جا سکتی ہے، نہ "اقامت دین" کا کام ہو سکتا ہے،

انھوں نے یہ خیال بھی پوری طاقت وصراحت سے ظاہر کیا کہ ایک محدود مدت کو چھوڑ کر بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ سب اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہو گئے، اور یہ کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی۔

پھر انھوں نے ان اصطلاحوں کی جو تعبیر و تشریح کی اور ان کا جو مرکزی نقطہ، اصل روح اور مرکزی خیال قرار دے کر اس پر زور دیا، اس نے اسلام و قرآن کی ایک نئی تفسیر کا نمونہ پیش کیا، جس پر سیاسی رنگ غالب ہے، اور وہ "حاکمیت الٰہ" اور "سلطانیٔ رب" کے گرد گھومتی ہے، اور اس سے نزول قرآن اور دعوت اسلامی کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام رہ جاتا ہے، نیز انھوں نے مقصد و وسائل کے بارے میں جو نیا موقف اختیار کیا اور عبادت و ذکر کے بارے میں جن خیالات اور نئی تحقیقات کا اظہار کیا ہے، اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ جو نسل خالص ان تحقیقات و خیالات کے سایہ میں پروان چڑھے گی اور جو جماعت محض اس لٹریچر کے اثر سے تیار ہوگی اور اس کا ذہنی رابطہ کسی اور ماحول سے نہیں ہوگا اس کا ایک نیا دینی مزاج بن جائے گا، جو اس مزاج سے مختلف ہوگا جس کو تربیت و صحبت نبوی، اسوۂ رسول اور صحابۂ کرامؓ کی اقتدا نے تیار کیا اور جو علیٰ سبیلِ التوارث اس وقت تک چلا آرہا ہے، اور اسی طرح اس کی فکر و سعی کی گاڑی اس پٹری سے ہٹ کر جس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہؓ اور ان کے تابعین و نائبین نے ڈالا تھا ایک دوسری پٹری پر پڑ جائے گی۔

پیش نظر کتاب صرف اس حصہ سے بحث کرتی ہے، وہ نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، نہ فقہ و فتویٰ کی زبان میں، وہ ایک اندیشہ کا اظہار ہے اور "الدین النصیحۃ" (دین خیر خواہی کا

نام ہے) کے حکم پر عمل کرنے کی مخلصانہ کوشش' اس کی نہ کوئی سیاسی غرض ہے، نہ کوئی جماعتی مقصد۔

باوجود اس کے کہ اس فریضہ کے انجام دینے کے لئے بہت سے قوی دواعی اور محرکات موجود تھے، جماعت اور اس کی فکری بنیادوں کے متعلق مختلف حلقوں سے برابر استفسار ہوتا رہتا تھا جن میں میرے جماعت سے اختلاف اور اس کے اسباب کے متعلق پوچھا جاتا تھا لیکن میں نے اس پر مستقل طور پر قلم اٹھانے سے احتیاط برتی اور اس کو برابر ٹالتا رہا، اس کی وجہ یہ بھی کہ یہ موضوع بڑا نازک تھا کیونکہ ایک ایسی جماعت اور ایسے رفقاء و فضلاء سے اس کا گہرا تعلق تھا جن سے مصنف کے دوستانہ و مخلصانہ تعلقات ہیں؛ اور دعوت اسلامی کے میدان اور ملی مسائل کے لئے جدوجہد کے سلسلہ میں سالہا سال سے ان کی رفاقت و تعاون کا سلسلہ جاری ہے' مسلمانوں کی نئی تعلیم یافتہ نسل کی فکری بیداری اور مسلمان نوجوانوں کا اسلام کے ایک زندہ جاوید دین اور اس کی قائدانہ صلاحیت پر اعتماد بحال کرنے میں اس نے قابل قدر اور ناقابل انکار خدمت انجام دی ہے، اسی طرح مصنف کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں اس تنقید و تبصرہ کو بعض حلقوں میں سیاسی و جماعتی مقاصد کے لئے نہ استعمال کر لیا جائے، یا اسے ذاتی غرض اور نفسانیت پر محمول نہ کیا جائے جس سے بچنا توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس صورت حال کے سبب اس موضوع پر قلم اٹھانا خاصا دشوار و ناخوشگوار کام تھا، اور بہت سے شکوک و سوالات پیدا کرنے کا موجب' لوگوں کے لئے کسی کام کو اچھے محمل پر محمول کرنا، ناقد یا مصنف کے لئے صالح محرکات و موجبات تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے، اور شک و شبہ، بدگمانی اور اعتراض آسان، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ

عرصۂ دراز سے اخلاص و انصاف پرستی، اور سیاسی اغراض اور ذاتی مقاصد کے شائبہ سے پاک تنقید کے بہت کم نمونے لوگوں کے سامنے آئے ہیں، اور اس بارہ میں ان کو بہت تلخ تجربات ہوئے ہیں، لوگوں نے بہت کم دیکھا ہے کہ اشخاص اور جماعتوں کی حمایت و عصبیت سے بالاتر ہو کر اور دین اور حق کو معیار سمجھتے ہوئے (جو ردّ و قبول اور ترجیح و انتخاب کی اصل بنیاد و اساس ہے) احقاق حق اور ابطال باطل کا بے لاگ کام کیا گیا ہو، اور دین کو اشخاص و تحریکات، عظیم حکومتوں کے مؤسسین اور دین و ملت کے قائدین و محسنین پر مقدم رکھا گیا ہو، جیسا کہ محدثین اور ائمۂ فن جرح و تعدیل کا اپنے عہد کے صلحائے کبار، زہاد و متقین، خلفاء و حکام، اور کشور کشاؤں اور فاتحین کے بارے میں شیوہ رہا ہے[1]۔

اس کام کی تکمیل میں مصنف کے لئے ایک دقت یہ بھی پیش آئی کہ اس کا عام اندازِ نگارش اور تصنیف و تالیف کا نہج شروع سے تعمیری، مثبت اور غیر مجادلانہ رہا ہے، اور اختلافی مسائل اور لفظی نزاعات سے اس نے ہمیشہ اجتناب کیا ہے، اور جہاں اس کو یہ خدمت انجام دینی پڑی اسے وقتی اور ضمنی طور پر انجام دیا[2]، اور وہ جلد اپنے مزاج اور معمول کے مطابق اصولی اور مقصدی مباحث و مسائل کی طرف واپس آ گیا، اس کے لئے اپنے عمر بھر کے معمول اور اپنی پسندیدہ روش سے انحراف کرنا کوئی آسان کام نہ تھا[3]۔

---

[1] ایسی دیانت دارانہ اور بے لاگ تنقید کے دلکش نمونے فن جرح و تعدیل کی کتابوں مثلاً "کتاب المجروحین" ابن حبان "میزان الاعتدال" ذہبی، اور صحیح مسلم کے مقدمے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ [2] جیسا کہ مصنف نے اپنی کتاب "النبوۃ والأنبیاء فی ضوء القرآن" (طبع ثالث) کے بعض حاشیوں (نوٹس) میں کیا ہے۔ [3] اس کلیے میں مصنف کی کتاب "قادیانیت" ایک استثناء ہے، اور یہ وہ واحد کتاب ہے جسے مصنف نے ایک خارج از اسلام فرقہ کے رد میں لکھا ہے جو اسلام کا مدعی ہے۔

اس موضوع پر اپنی افتادِ طبع اور طرزِ عمل کے خلاف اسی وقت قلم اٹھایا گیا جب اس کا پوری طرح مشاہدہ اور تجربہ ہو گیا کہ اس دعوت اور لٹریچر سے جو جماعت تیار ہو رہی ہے اس کا ایک نیا دینی مزاج بنتا جا رہا ہے جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ دین کا ایک نیا فہم، نئی تعبیر اور نئے اقدار و معیار پیدا کر لے، اور اس طرح ملت کے ایک تعلیم یافتہ، فہیم، مخلص اور باعمل و صاحبِ عزم طبقہ کی فکر و سعی کا کارواں کتاب و سنت، سیرت و اسوۂ رسولؐ، فکرِ آخرت اور "ایمان و احتسابؓ" کی شاہراہ سے ہٹ کر محض جماعتی تنظیم اور مسلمانوں کے لئے حصولِ حکومت و اقتدار کے راستہ پر پڑ جائے اور پھر اس کی واپسی مشکل ہو جائے، اس ناخوشگوار کام کو (خدا علیم و خبیر ہے کہ) عند اللہ مسئولیت اور شہادتِ حق کے خیال سے انجام دیا گیا۔

امید ہے کہ خود جماعت اسلامی کے حلقہ کے لوگ اس کتاب کو غور و سنجیدگی کے ساتھ پڑھیں گے اور اس کو کسی جماعتی تعصب یا ذاتی غرض پر محمول نہ کریں گے، نہ اس کو تحریکِ اسلامی اور اقامتِ

لہ احادیثِ صحیحہ میں بہت سے اعمالِ صالحہ بلکہ فرائض تک پر قبولیت و اجر و ثواب ملنے کے لئے یہ شرط کی گئی ہے کہ وہ "ایمان و احتساب" کی کیفیت کے ساتھ ادا کئے گئے ہوں، حالانکہ ایمان کی غیر موجودگی میں ان اعمال کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، فرمایا گیا "من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ" (بخاری) "من قام لیلۃ القدر ایمانا واحتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ" (بخاری) اس ایمان و احتساب کی تشریح بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں "رجاء ثوابہا وتصدیق موعودہا" کے الفاظ آئے ہیں یعنی اس کے اجر کی امید اور اس پر خدا کا جو وعدہ ہے، اس پر یقین کرتے ہوئے، اسی طرح "ایمانا واحتسابا" کے معنی ہوئے اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر و ثواب کے لالچ میں، یہی اعمال کی روح اور اس امت کے لئے سب سے بڑی قوت محرکہ ہے اور اس کی حفاظت قیامت تک کے لئے امت کے داعیوں اور مصلحین کی ذمہ داری ہے۔

دین کی کوشش کی مخالفت پر محمول کریں گے جس کے روشن امکانات پیدا ہوگئے ہیں، اور ہر حق پسند اور اسلام دوست کو اس کی ترقی سے خوش ہونا چاہیے۔

جو لوگ دین کی سنجیدہ اور مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہیں، اور صرف اسلام اور خدا کے نام کی سربلندی چاہتے ہیں، نیز ان میں طلبِ حق کی جستجو، اپنے دینی فہم کی تصحیح اور اس کی ترقی و تکمیل کا جذبہ پایا جاتا ہے، اور ان کے نزدیک معیارِ حق ہوتا ہے نہ کہ کوئی جماعت اور شخص (خواہ وہ کتنا بڑا ہو) انھوں نے ہمیشہ صحت مند اور تعمیری تنقید، مختلف نقطہائے نظر کے اظہار اور مخلصانہ مشورہ کی قدر کی ہے، یہ امت اپنی طویل تاریخ، افکار، اجتہادات اور تجربات کے درمیان طویل سفر میں مہلک ٹھوکروں اور اجتماعی انحراف و تحریف سے جو محفوظ رہی ہے، اس کی بڑی وجہ یہی علمی احتساب اور بے غرضانہ دینی تنقید تھی، اس کا سلسلہ بند ہوجانا اور کسی جماعت یا مکتبِ خیال کا اس کی اجازت نہ دینا ایک خطرناک اقدام ہے، حماسہ کے عرب شاعر نے صدیوں پہلے جو کہا تھا، وہ آج بھی ایک حقیقت ہے کہ۔ ع

وفی العتاب حیاۃ بین اقوام

(دوستانہ شکایت اور گلہ میں جماعتوں اور قوموں کی زندگی کا راز ہے)

افکار و آراء کی تصحیح، نظریات کی تنقیح اور فقہی دبستانوں کی توسیع میں (جس کی دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی، اور جس سے امت کو ہمیشہ مختلف حالات میں وسعت و سہولت حاصل ہوتی رہی ہے) اس تعمیری تنقید کا بہت اہم حصہ رہا ہے، اسی طرح اس نے علماء و مفکرین اسلام کو خود رائی، خود پسندی، اپنے متعلق "معصوم عن الخطا" ہونے کی غلط فہمی اور ان کے متبعین کو ان کے بارے میں حد سے بڑھے ہوئے غلو و مبالغہ سے بچایا ہے، اور اس امت کو اس نقطۂ اعتدال اور صراطِ مستقیم

پر قائم رکھا ہے، جو مسلمانوں بالخصوص "اہل سنت" کی خصوصیت ہے۔

جب اس علمی ودینی محاسبہ کا دوسرے مذاہب (خصوصاً مسیحیت میں) دروازہ بند ہو گیا یا اس کی جرأت کرنے والے خال خال رہ گئے تو وہ غلو پسندوں کی تحریفات، اہل باطل کی افتراء پردازیوں اور جہلاء کی مضحکہ انگیز تاویلات کا شکار ہو گئے، اور ان مذاہب کی سرزمین پر ایسے جھاڑ جھنکاڑ اور گھنے جنگل اُگ آئے جنھوں نے ان کی اصلیت اور اولین تعلیمات کا چہرہ ڈھک دیا، اسی لئے شریعت مطہرہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب ٹھہرایا اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں اس فریضہ کو زندہ و برپا رکھنے کی تاکید کی اور اس میں سستی سے کام لینے اور اصحاب جاہ واقتدار کی رعایت سے خاموشی اختیار کرنے کو گناہ کبیرہ بنایا، اور کسی جابر طاقت کے آگے کلمۂ حق کہنے کو "افضل جہاد" ٹھہرایا، چنانچہ مسلمان عوام اور خاص طور پر علمائے اسلام اس فریضہ کو بڑے ـــــ بگڑے ہوئے ماحول اور ظالم وشمشیر بکف حکمرانوں کے عہد میں ادا کرتے رہے، امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ (جن کی سطوت وشوکت سے قیصر وکسریٰ لرزہ براندام رہتے تھے) نے ہر کمزور اور عامی شخص کو اس حق گوئی کی اجازت دی اور اسے خوش آمدید کہا، فرمایا "لاخیر فیھم اذ لم یقولوھا لنا ولاخیر فینا اذ لم نقبل"[۱] (اگر یہ لوگ ایسی صاف باتیں ہم سے نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں، اور اگر ہم ان کے اعتراضات ہنسی خوشی نہ سنیں تو ہم سے بُرا کون ہے؟) اسی طرح ایک بار فرمایا، "امرأة اصابت ورجل أخطأ"[۲] (ایک عورت نے

---

[۱] کتاب الخراج از امام ابو یوسف ص ۔ [۲] محدث عبد الرزاق نے حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک بار انھوں نے کہا کہ عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کرو، اس پر ایک عورت نے انھیں ٹوکا کہ اے عمر تمہیں اس کا حق نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا" (تم ان کو مہر میں (باقی ص ۲۷ پر)

صحیح بات کہی اور ایک مرد نے غلطی کی۔)

کسی قابل احترام شخصیت کی غلطی یا لغزش یا سہو و نسیان پر سکوت کے لئے یہ وجہ جواز نہیں ہو سکتا کہ وہ شخصیت منصب قیادت پر فائز یا ملت کے کسی اجتماعی مفاد اور خدمت میں منہمک ہے اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کو عظیم فائدہ حاصل ہو رہا ہے، یا حاصل ہونے کی توقع ہے، اس کی غلطی کی نشاندہی کرنے یا اس کو صائب مشورہ دینے سے اس کی طرف سے بے اعتمادی یا جماعت میں انتشار پیدا ہوگا، نہ اس فریضہ (انتباہ و اشارہ) کی ادائیگی میں اس شخص کی دینی خدمات، مجاہدانہ کارنامے اور ذاتی فضائل و کمالات کبھی حائل ہو سکتے ہیں، چنانچہ ہم صحابہ کرامؓ کو افضل الرسل اور خیر البشر صلے اللہ علیہ وسلم کو سہو و نسیان کے مواقع پر ٹوکتے ہوئے دیکھتے ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار چار رکعتوں والی نماز میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں تو ذوالیدین صحابی نے آپؐ سے استفسار فرمایا کہ "أقصرت الصلاۃ أم نسیت یا رسول اللہ؟"[1] (یا رسول اللہ کیا نماز ہی کم کردی گئی یا آپ کو سہو ہوا؟) نہ آپ نے اس پر برا مانا اور ان کی سرزنش کی، نہ صحابہؓ

(باقی ص۲۶ کا) ڈھیر سارا مال دے چکے ہو)، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "امرأۃ خاصمت عمر فخصمتہ" (ایک عورت نے عمرؓ سے بحث کی اور وہ غالب آگئی) زبیر ابن بکار نے "امرأۃ اصابت ورجل أخطأ" کا لفظ لکھا ہے۔ (نیل الاوطار ۶/۱۷۰)۔

[1] ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب دو رکعت پر سلام پھیرا تو ذوالیدینؓ نے فوراً پوچھا یا رسول اللہ! کیا نماز کم ہوگئی یا آپ بھول گئے ہیں؟ اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا ذوالیدین ٹھیک کہہ رہے ہیں؟ (باقی ص۲۸ پر)

نے ان کو نشانۂ ملامت و تعریض بنایا، بلکہ آپ نے اور صحابہ کرام نے اس سے فائدہ اٹھایا اور نماز کی تکمیل کی۔

اسی طرح امیر المومنین حضرت عمرؓ نے (جو اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کو سب سے بہتر سمجھنے والے تھے) سیدنا خالدؓ کو جنگ یرموک میں (جو تاریخ اسلام کی ایک فیصلہ کن جنگ تھی) معزول کر کے حضرت ابو عبیدہؓ کو اسلامی افواج کا قائد مقرر کردیا، اگر مسلمان دور ماضی میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار سے بچنے کے خیال سے غلطیوں اور لغزشوں پر لوگوں کو نہ ٹوکتے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، دینی احتساب، اور شہادت حق کا حیات بخش دھارا امت کے اجتماعی و اخلاقی وجود سے کٹ جاتا، اور اس کی رگوں میں تازہ خون نہ پہنچتا، اور اس کے نتیجہ میں اہل علم و اہل الرائے حس شک و التباس میں مبتلا اور عوام گمراہی کا شکار ہوتے اور دین کے بہت سے حقائق مخفی رہ جاتے، وہ کسی قائد و امام یا نابغۂ عصر کی تعبیری غلطی یا فہم و تفہیم میں اعترافِ خطا کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک ہوتا، کیونکہ غلطی سے بری ہونا صرف خدا کی صفت ہے، اور رسول اللہؐ کے سوا ہر شخص کی بات میں رد و قبول کا اختیار باقی رہتا ہے۔

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ جس جماعت کی ابتدا ہی تمام اسلامی تاریخ اور

(باقی ص۲۷ کا) تو لوگوں نے کہا جی ہاں، جس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر دوسری رکعتیں پڑھیں، پھر سلام پھیرا، پھر تکبیر کہی، اور سجدہ کیا، جیسا کہ آپ کرتے تھے، یا اس سے کچھ طویل، پھر تکبیر کہی اور سجدہ سے سر اٹھایا اور پھر اپنے حسب معمول سجدے کے مطابق یا اس سے طویل سجدہ کیا۔"

(سنن ترمذی، ابواب الصلاۃ، یہ حدیث صحیحین اور موطا میں بھی ہے۔)

اسلامی طبقات پر عمومی اور جسارت آمیز تنقید اور تمام تحریکات اور کوششوں کے آزادانہ اور بے لاگ جائزہ سے ہوتی ہے، اس کے ارکان و رفقا میں بانیٔ جماعت کے لئے تقدیس کی حد تک تعظیم اور ان پر ہونے والی تنقیدات و اعتراضات کے خلاف بڑی ذکاوت حس پائی جاتی ہے۔[1]

خود مولانا نے "تجدید و احیائے دین" کتاب لکھ کر جس میں مسلم الثبوت مجددین امت کے کارناموں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے، اور ان میں سے کسی کی عظمت و شہرت اور لوگوں کا اعتماد و استناد اور عقیدت و شیفتگی ان کو اپنے خیالات و احساسات کے اظہار سے روک نہیں سکی، اس کی ایک نظیر قائم کر دی۔

پیش نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک حقیر کوشش ہے جسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اختیار کیا ہے، مجھے معاف کیا جائے کہ مواصلات کا (ONE WAY-TRAFFIC) کا قانون، علمی تنقید، صالح و مفید تر چیزوں کی تحقیق، اور فکر و مطالعہ کے نتائج پر عائد نہیں ہوتا، اور اگر فکر و تحریر کی دنیا میں بھی یہ قانون چل پڑے تو ذہن انسانی شل، علمی سرگرمی معطل اور امت میں اصلاح و تجدید اور خوب سے خوب تر کی جستجو کا کام بند ہو جائے، جو ایسا شجرۂ مبارکہ ہے کہ جس کی جڑیں زمین میں

---

[1] مؤلف کے لئے یہ امر خلاف توقع تھا کہ کتاب کے اردو ایڈیشن کے نکلتے ہی جماعت کے حلقے سے ایسے غصہ سے بھرے خطوط موصول ہونے لگے جن میں شدید بیزاری اور سخت تنقید موجود تھی، مصنف کو یہ امید تھی کہ دوسری جماعتوں کے غالی معتقدین کے برخلاف جماعت سے تعلق رکھنے والے احباب زیادہ کشادہ قلب اور وسیع النظر ثابت ہوں گے، اور شخصی و معاندانہ مخالفت اور اصولی و مقصدی اختلاف میں فرق کریں گے۔

اور شاخیں آسمان میں ہیں، اور باذنِ خدا وہ ہر وقت ثمر ریزی کرتا رہتا ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

ابوالحسن علی حسنی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ۔ رائے بریلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح

کیا قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں صدیوں تک پردۂ خفا میں، اور اسلام کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور رہی ؟

عصرِ حاضر کے مشہور مصنف و مفکر، اور جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی مشہور و مقبول کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات" میں "الٰہ" "رب" "دین" "عبادت" کے قرآنی کلمات اور اسلامی اصطلاحات کا ذکر کرتے ہوئے، یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے وقت اس کا ہر مخاطب جس کی زبان عربی تھی، ان چاروں بنیادی اور قرآنی اصطلاحوں کے صحیح معنی اور مفہوم سے آشنا تھا، وہ لکھتے ہیں :۔

"عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا، اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ "الٰہ" کے کیا معنی ہیں، اور "رب" کسے کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے، انھیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے، اس لئے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا "الٰہ" اور "رب" ہے، اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعًا کوئی حصہ نہیں تو وہ پوری بات کو پا گئے، انھیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم

ہوگیا کہ دوسروں کے لئے کس چیز کی نفی کی جارہی ہے، اور اللہ کے لئے کس چیز کو خاص کیا جارہا ہے، جنھوں نے مخالفت کی، یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت وربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے، اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ اس عقیدہ کو قبول کرکے ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہوگا۔

اسی طرح "عبادت" اور "دین" کے الفاظ بھی ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے، ان کو معلوم تھا کہ "عبد" کسے کہتے ہیں، عبودیت کس حالت کا نام ہے، عبادت سے کون سا رویہ مراد ہے، اور "دین" کا کیا مفہوم ہے، اس لئے جب ان سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کرو، اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ تو انھیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی، وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔[1]

لیکن یہ صورت حال قائم نہیں رہی، یہ بدیہی حقیقتیں نگاہوں سے مستور ہوگئیں، اور قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں پر جو گویا اسلام کے لئے "اصول موضوعہ" کی حیثیت رکھتی تھیں، جہالت، عجمیت، اور غفلت کے دبیز پردے پڑ گئے، وہ مندرجہ بالا عبارت کے بعد لکھتے ہیں:۔

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہوگیا، اس کی ایک وجہ تو

---

[1] "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" ص۸ شائع کردہ دارالاشاعت، نشاۃ ثانیہ، حیدرآباد۔

خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے، ان کے لئے "الٰہ" اور "رب" اور "دین" و "عبادت" کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے، جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے، انھیں دونوں وجوہ سے دور اخیر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے، مثلاً لفظ "الٰہ" کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنا دیا گیا۔ "رب" کو پالنے اور پوسنے والے، یا پروردگار کا مترادف ٹھہرایا گیا۔ "عبادت" کے معنی پوجا اور پرستش کے کئے گئے۔ "دین" کو دھرم اور مذہب اور (RELIGION) کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا۔

"طاغوت" کا ترجمہ بت یا شیطان کیا جانے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا۔"[1]

پھر اس تغیر حال کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم، بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے، اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آرہے ہیں، ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔"[2]

امت کی صلاحیت اخذ و فہم، اور قرآن کی خصوصیت "اِبانت" و افادیت

ان عبارتوں کا پڑھنے والا جس کا مطالعہ گہرا اور وسیع نہیں ہے، اور جو اس حقیقت

---

[1] ایضاً ص۔۹ [2] ایضاً ص۱۰

سے واقف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عام گمراہی، اور دین سے ایسی ناآشنائی سے محفوظ رکھا ہے، جو زمان و مکان کے حدود سے بے نیاز ہو کر ساری امت پر سایہ فگن ہو، یہ نتیجہ نکال سکتا ہے، کہ قرآن مجید کی حقیقت اس طویل مدت تک امت کی (یا زیادہ محتاط الفاظ میں امت کے اکثر افراد کی) نگاہ سے اوجھل رہی، اور امت بحیثیت مجموعی ان بنیادی الفاظ کی حقیقت ہی سے بے خبر رہی، جن کے گرد اس کتاب کا پورا نظام گردش کرتا ہے، اور جن پر اس کی تعلیمات اور دعوت کی عمارت قائم ہے، اور یہ پردہ اِس (بیسویں) صدی کے وسط ہی میں اٹھ سکا۔

یہ نتیجہ اگرچہ بادی النظر میں کچھ زیادہ اہم اور سنگین نہ معلوم ہو، لیکن اس کے اثرات ذہن و دماغ، اور طرز فکر پر بڑے گہرے اور دور رس ہیں، اس لئے کہ یہ اس امت کی صلاحیت ہی میں شک و شبہ پیدا کر دیتا ہے، جو نہ صرف اس دین و پیغام کی حامل ہے، بلکہ اس کو دنیا میں پھیلانے، اس کی تشریح کرنے، اور اس کی حفاظت کی بھی ذمہ دار ہے، اور اس سے اس امت کی گذشتہ تاریخ اس کے مجددین، مصلحین اور مجتہدین کے علمی و عملی کارنامے بھی مشکوک اور کم قیمت ہو جاتے ہیں، اور آئندہ کے لئے بھی یہ بات بڑی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ کہا اور سمجھا گیا ہے، وہ صحیح ہے، اور جو کچھ کہا اور سمجھا جائے گا وہ ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، اس سے "ظاہر و باطن" اور "مغز و پوست" کے اس فلسفہ اور دینی حقائق کو ایک نہایت عسیر الفہم معمہ اور چیستاں قرار دینے کی سعی کو شہ ملتی ہے جس سے باطنیوں کے مختلف فرقوں نے مختلف زمانوں میں فائدہ اٹھایا۔

الفاظ و معانی کا رشتہ

شاید بہت سے قارئین جن کی مذاہب و فرق کی تاریخ پر گہری نظر نہیں ہے اس اجمال کو

سمجھنے سے قاصر رہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ باطنیوں کی اس ٹکنک کے متعلق راقم سطور نے اپنی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" کے پہلے حصے میں جو کچھ لکھا تھا، اس کو نقل کر دیا جائے۔

"انھوں نے (باطنیوں نے) دیکھا کہ شریعت کے اصول وعقائد اور احکام ومسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ۔	اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا مگر اپنی قوم ہی کی زبان میں تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کردے۔
(سورۂ ابراہیم ۔ ۴)	

ان الفاظ کے معنی ومفہوم متعین ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ان کی تشریح اور اپنے عمل سے ان کی تعیین کر دی ہے، یہ معنی ومفہوم امت میں عملی و لفظی طور پر تواتر وتسلسل سے چلے آرہے ہیں، اور ساری امت اس کو جانتی اور مانتی ہے، نبوت ورسالت، ملائکہ، معاد، جنت ودوزخ، شریعت، فرض وواجب، حلال وحرام صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، یہ سب وہ الفاظ ہیں جو خاص دینی حقائق کو بیان کرتے ہیں، اور جس طرح یہ دینی حقائق محفوظ چلے آرہے ہیں، اس طرح ان دینی حقائق کو ادا کرنے والے یہ الفاظ بھی محفوظ چلے آرہے ہیں، اور اب دونوں لازم وملزوم بن گئے ہیں۔

جب نبوت ورسالت یا نبی یا صلوٰۃ یا زکوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس وقت اس کی وہی حقیقت سمجھ میں آئے گی، اور وہی عملی شکل سامنے آئے گی، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور صحابہ کرام نے اس کو سمجھا، اس پر عمل کیا، اور اس کو دوسروں تک پہونچایا، اور اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ وہ چیز امت تک منتقل ہوتی رہی، انھوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ ومعانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و

علمی نظام کی بنیاد ہے اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرچشمہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے، اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں، یا مشکوک ہو جائیں، تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے، اور اس کے سنگین قلعہ میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شگاف پیدا ہو سکتے ہیں۔[1]

قرآن کی بنیادی صفات وخصوصیات

یہ اس علمی حقیقت اور عقیدہ کے بھی خلاف ہے، کہ یہ دین اس نسل کو صرف کتابی شکل ہی میں نہیں ملا، بلکہ ایک نسل نے دوسری نسل تک اس کے الفاظ و مفاہیم بلکہ طریق عمل تک کو منتقل کیا، اور توارث کا یہ سلسلہ لفظ اور معنی دونوں میں جاری رہا، نیز اللہ تعالے نے قرآن مجید کو جابجا "الکتاب المبین" اور "عربی مبین" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

سورۂ یوسف کے آغاز میں فرمایا:۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ۝	الر۔ یہ کتابِ روشن کی آیتیں ہیں ہم نے
اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ	اس قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے تاکہ
تَعْقِلُوْنَ۝ (سورہ یوسف ۱-۲)	تم سمجھ سکو۔

سورۂ حجر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْاٰنٍ	الر۔ یہ (خدا کی) کتاب اور قرآن روشن
مُّبِيْنٍ۔ (الحجر-۱)	کی آیتیں ہیں۔

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت (حصۂ اول) ص۱۳۹-۱۴۰

سورۂ نمل اس طرح شروع ہوتی ہے :-

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ۔ (سورہ نمل - ۱)
طٰس۔ یہ قرآن اور کتاب روشن کی آیتیں ہیں۔

سورۂ شعراء کی پہلی آیت ہے :-

طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (سورہ شعراء ۱-۲)
طٰسم۔ یہ کتاب روشن کی آیتیں ہیں۔

سورۂ شعراء میں اس وحی کی (جو قلب مبارک پر حضرت جبرئیل کے ذریعہ نازل ہوئی) تفہیم و ابانت کی صلاحیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :-

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (سورہ شعراء ۱۹۲ تا ۱۹۵)
اور یہ (قرآن خدائے) پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے (یعنی اس نے) تمہارے دل پر (القا) کیا ہے تاکہ (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو اور (القا بھی) فصیح عربی زبان میں (کیا ہے)

سورۂ دخان کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے۔

حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ (سورہ حم ۱-۲)
حٰم۔ اس کتاب روشن کی قسم۔

جس کتاب کے مبین، واضح اور قابل فہم ہونے کا تذکرہ خود قرآن میں اس شد و مد سے اور بار بار کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ باور کرنا مشکل ہے کہ وہ اپنی ان چار بنیادی اصطلاحات کے (جن پر اس کا پورا نظام اعتقاد و عمل اور دعوت و تبلیغ گردش کرتا ہے) صحیح مفہوم اور حقیقی مدلول کے سمجھانے سے قاصر رہی۔[۱]

[۱] خود مولانا مودودی سورہ حجر کی تفسیر میں "المبین" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیات اس قرآن کی ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف ظاہر کرتا ہے"

متعدد مقامات پر اس کی آیات کے محکم اور مفصّل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے:۔

ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِىٓ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ اٰيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ۔ (سورہ آل عمران ۔ ۷)	وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں۔
فَإِذَآ أُنْزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِى قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِىِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ۔ (سورہ محمد ۔ ۲۰)	لیکن جب کوئی صاف معنوں کی سورت نازل ہو اور اس میں جہاد کا بیان ہو تو جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے تو تم ان کو دیکھو کہ تمہاری طرف اس طرح دیکھنے لگیں جس طرح کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو رہی ہو۔
الٓرٰ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ اٰيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ۔ (سورہ ہود ۔ ۱)	یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے بتفصیل بیان کردی گئی ہیں۔

مشہور مفسر حافظ ابن کثیر آیات "مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "أی بينات واضحات الدلالة لا التباس فيها على أحد" (یعنی روشن، دلالت میں ایسی واضح کہ کسی کو ان کے بارے میں اشتباہ نہیں ہو سکتا) محمد بن اسحاق بن یسار کا قول اس کے بارے میں نقل کرتے ہیں۔

فهن حجة الرب وعصمة العباد — وہ آیتیں خدا کی حجت ہیں بندوں کی حفاظت

ودفع الخصوم الباطل ليس لهن تصريف ولا تحريف عما وضعن عليه[1] — اور مخالفین و معترضین کی زبان بندی کا سامان ہیں' ان کو اپنے مدلول حقیقی سے پھیرا اور ہٹایا نہیں جاسکتا۔

علامہ آلوسی اپنی مشہور تفسیر روح المعانی میں "محکمات" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

صفۃ آیات أی واضحۃ المعنیٰ ظاھرۃ الدلالۃ محکمۃ العبارۃ محفوظۃ من الاحتمال والاشتباہ۔[2] — محکمات آیات کی صفت ہے' مطلب یہ ہے کہ یہ آیات اپنے معنی میں واضح اپنی دلالت میں ظاہر اور اپنی عبارت میں محکم ہیں' وہ ہر احتمال و اشتباہ سے محفوظ ہیں۔

جہاں تک قرآن مجید کے مفصل ہونے کا تعلق ہے قرآن مجید کے ۵ا مقامات میں مختلف صیغوں میں اس کے مفصل ہونے کا تذکرہ ہے۔[3]

یہ صفات اور تعریفیں بھی اس خیال کے منافی ہیں کہ قرآن مجید کے متعدد بنیادی حقائق طویل عرصہ تک پردۂ خفا میں رہے' سورۂ حجر میں فرمایا گیا:۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (الحجر۔ ۹) — ہمیں نے اتاری ہے یہ نصیحت (یعنی قرآن) اور ہمیں اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر اول سورہ آل عمران [2] تفسیر روح المعانی اول سورہ آل عمران۔

[3] انعام ۵۸-۹۷-۹۸ و ۱۲۶۔ اعراف ۳۲، ۵۲-۱۷۴، التوبہ ۱۱، یونس ۵، ۲۴، الروم ۲۸۔ الرعد ۲۔ ہود ۱، فصلت ۳ و ۴۴

فضل و احسان جتانے کے موقعہ پر حفاظت کے وعدے کے اعلان میں اس کے مطالب کا فہم ان کی تشریح، اس کی تعلیمات پر عمل اور زندگی میں ان کا انطباق بھی شامل ہے، ایسی کتاب کی کیا قدر و منزلت ہو سکتی ہے اور اس کی حفاظت کا کیا فائدہ اور نتیجہ ہے، جو طویل مدت تک معطل پڑی رہے، نہ سمجھی جائے، نہ اس پر عمل کیا جائے؟ نیز اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ[1]	اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم اس کو سنا کرو، اور پھر اسی طرح پڑھا کرو، پھر اس کے معانی کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

"إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" کی تفسیر کرتے ہوئے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی معرکۃ الآرا کتاب "ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن مجید کی توضیح ہمارے ذمہ ہے، ہم ہر زمانہ میں ایک جماعت کثیر کو قرآن مجید کے وضاحت طلب الفاظ کی تشریح اور اسباب نزول کے بیان کی توفیق دیتے رہیں گے تاکہ ان کا صحیح مصداق لوگوں کے سامنے آجائے، اس کا نمبر حفظ قرآن و تبلیغ قرآن کے بعد ہے، خود آنحضرت قرآن مجید کی تشریح و تفسیر کرنے والے تھے، قرآن مجید کے مصاحف میں محفوظ و مدون ہو جانے اور اس کی تلاوت کا رواج عام ہو جانے کے بعد تفسیر کی باری آئی اور عملی طور پر ایسا ہی ہوا، چنانچہ حضرت ابن عباس سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔"[2]

"إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" کے واضح اور موکد وعدہ الٰہی کے بعد یہ سمجھنا کہ قرآن مجید کے ایسے کلیدی

---

[1] سورۃ القیامہ ۱۷-۱۹ [2] ازالۃ الخفا (فارسی) ص۵۱

الفاظ جن کے بغیر اس کے مطالب و معانی، احکام و مطالبات تک رسائی ممکن نہیں صدیوں تک مغلق و مقفل رہے، آیت کے مفہوم و مقتضا کے خلاف ہے۔

امت مسلمہ کُلّی طور پر کسی دور میں جہالت عامہ و ضلالت مطلقہ میں مبتلا نہیں ہوئی

اس طرز تحقیق اور طرز کلام سے ضمنی طور پر نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ امت پر ایک ایسا طویل دور گذرا ہے جب وہ قرآن مجید کے ایسے اہم بنیادی اصطلاحات کے صحیح مفہوم اور مضمرات سے ناآشنا رہی ہے، جن پر اس کے صحت فکر، اور صحت عمل کا دارومدار ہے، اور جس کو صریح جہالت و غفلت، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ضلالت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، حالانکہ کتاب و سنت اور احادیث کے ذخیرہ سے مجموعی اور اصولی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ امم سابقہ کے برخلاف یہ امت کسی دور میں بھی عمومی و عالمگیر ضلالت میں مبتلا نہیں ہوگی، جلیل القدر محدثین و علماء نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگرچہ مشہور روایت "لا تجتمع أمتی علی ضلالۃ" (میری امت کبھی ضلالت و گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی) لفظاً و سنداً ثابت نہیں ہے لیکن وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحیح ہے، مشہور اندلسی محدث و ناقد علامہ ابو محمد علی بن حزم (م ۴۵۶ھ) اپنی کتاب "الإحکام فی اصول الأحکام" میں لکھتے ہیں:۔

"محدثین کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ امت محمدی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی بھی غیر حق پر متفق نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ آپ نے اس کی خبر دی ہے کہ ہر دور میں حق کے علمبردار رہیں گے، بیان کیا گیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "لا تجتمع أمتی علی ضلالۃ" اگرچہ اس کے الفاظ و سند درجۂ صحت کو نہیں پہونچے[1]، لیکن اس کا مفہوم اور نتیجہ ان احادیث کی بنا پر جن میں ہر دور میں حق پر قائم رہنے

---

[1] یہ علامہ ابن حزم کی رائے ہے، ورنہ مشہور محدث و ناقد حدیث، علامہ سخاوی کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کا متن مشہور ہے، اور اس کی اسانید کثیر اور اس کے شواہد متعدد ہیں۔ (المقاصد الحسنۃ)

والوں کی خبر دی گئی ہے صحیح اور ثابت ہے"[1]

حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ :۔

"خدا کا شکر ہے کہ امت ایک سنت پر عمل کرنے کے ترک پر کبھی مجتمع نہیں ہوئی سوائے اس سنت کے جس کا نسخ ظاہر و ثابت ہے"[2]

حافظ ابن کثیر اپنی مشہور تفسیر میں سورۃ نساء کی آیت "وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"امت کے لئے اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ وہ کسی غلط چیز پر متفق ہو جانے سے محفوظ کر دی گئی ہے"[3]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اجماع کی بحث کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں :۔

"امت کا اجماع اپنی جگہ پر حق ہے اس لئے کہ امت الحمد للہ کسی ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی جیسا کہ کتاب و سنت میں اس کی صفت میں بیان کیا گیا ہے ارشاد ہے کہ "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ" نیز "الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ" نیز "وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" تو اگر امت دین کے بارے میں کسی ضلالت کی معتقد ہو جائے تو گویا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہیں کیا گیا، اسی طرح ارشاد ہے "وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا" (مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ ج ۱۹ ص ۱۷۶-۱۷۷ مطبوعہ حکومت سعودیہ)

عقل سلیم کی شہادت

عقل سلیم بھی اس کو آسانی سے باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ یہ امت عظیم جس میں

---

[1] الاحکام ج ۴ ص ۱۳۱ طبعہ اولیٰ مطبعۃ سعدۃ مصر [2] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۲۰ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ مطبع دار الاندلس ص ۳۹۳

[4] حفاظت دین کے سلسلے میں شرعی و عقلی دلائل کی تفصیل کے لئے علامہ ابو اسحاق شاطبی (م ۷۹۰ھ) کی عظیم کتاب "الموافقات فی اصول الشریعۃ" جزء ثانی کا مسئلہ ثانیہ عشرہ ملاحظہ کریں جس کی ابتدا انھوں نے اس طرح کی ہے "یہ شریعت مبارکہ اسی طرح معصوم ہے جیسے اس کے لانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں اور جیسا کہ اجماعی طور پر آپ کی امت معصوم ہے" جلد دوم ص ۵۸-۶۱ علمی و تاریخی حیثیت سے وہ بحث بھی قابل مطالعہ ہے جو مصنف نے صیانت دین کے متعلق لکھی ہے۔

سر آمد روزگار علماء، مدونین علوم و فنون، اور اذکیائے عصر بڑی تعداد میں پیدا ہوئے (بالخصوص ابتدائی صدیوں میں جو عہد رسالت اور عصر نزول قرآن سے قریب تر تھیں) مسلسل طریقہ پر ایسے بنیادی حقائق سے جن پر فہم قرآن اور دعوت الی الخیر کا مدار ہے، مسلسل ناآشنا اور بے خبر رہی، خود مولانا مودودی کا ذہن اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ پوری امت کے علماء (قرآن کی بنیادی اصطلاحوں سے قطع نظر کہ ان پر تو سارے دینی فکر و عمل کا دارومدار ہے) کسی ایک نص یا حدیث صحیح کا مطلب سمجھنے میں غلطی کا شکار ہوں، اور مدت دراز تک اس غلطی کا پردہ چاک نہ ہونے پائے، وہ مشہور حدیث "الأئمة من قريش" کے بحث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

> "کیا یہ بات باور کئے جانے کے لائق ہے کہ پوری امت کے علماء بالاتفاق ایک نص کا مطلب سمجھنے میں غلطی کر جائیں، اور صدیوں اس غلطی میں پڑے رہیں؟"[1]

حالانکہ حدیث "الأئمة من قريش" کا تعلق نہ عقائد سے ہے، نہ وہ ضروریات و قطعیات دین میں داخل ہے، بخلاف قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں کے جن پر دین کا پورا محور گردش کرتا ہے۔

مولانا نے اسی اصول سے (جو ہر طرح معقول اور واجب التسلیم ہے) قادیانیوں کے مقابلہ میں "خاتم النبیین" کے لفظ سے استدلال کیا ہے، جس کا ایک ہی مفہوم امت مسلمہ اپنے ہر دور میں سمجھتی چلی آئی ہے، اور نہایت تفصیل سے ہر دور کے اساطین امت کے اقوال نقل کئے ہیں۔[2]

ایک مصری فاضل اور اخوان کے مرشد عام کا تبصرہ و تنقید

استاذ حسن اسماعیل الہضیبی جو الامام الشہید شیخ حسن البنا کے بعد بالاتفاق

---

[1] تفہیمات حصہ سوم صہ ۱۷۶ شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی

[2] ملاحظہ ہو تفہیم القرآن تفسیر سورۃ احزاب ۷ تا ۔ اور قادیانی مسئلہ

اخوان المسلمین کے مرشد عام منتخب ہوئے، اور جن کے علم و صلاح، اخلاص، دینی فہم اور استقامت پر پوری جماعت کا اتفاق تھا، مولانا مودودی کی "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کا تمہیدی مضمون نقل کرنے کے بعد (جو اوپر گذر چکا ہے) تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب "دعاۃ لا قضاۃ" میں (جو ابھی حال میں مصر سے شائع ہوئی ہے) لکھتے ہیں:۔

"یہ دعویٰ واقعہ اور تاریخی حقیقت کے مطابق نہیں ہے، اس لئے کہ ان کلمات کے جاہلیت میں جو بھی معانی و مفہومات رائج رہے ہوں، قرآن کریم ان کے اس خاص معنی کو معین کرتا ہے جو ان کلمات سے اس کا مقصود ہے، اور ان لفظوں میں سے ہر لفظ سے اس کی جو مراد ہے، اس کا پورا تعارف کراتا ہے، اور اس کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس مفہوم کے چہرے سے اس طرح نقاب اٹھاتا ہے کہ اشتباہ یا ابہام کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا، قرآن کی اس وضاحت نے ان کلمات کے اصل لغوی مفہوم کی طرف رجوع کرنے، اور اس کے نزول سے پہلے ان کے جو معانی تھے، ان کا سراغ لگانے کی ضرورت باقی نہیں رکھی، کوئی مسلمان اس بارے میں ذرا بھی شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ قرآن کا طریقۂ بیان، اور اس کی شرح و وضاحت سب سے زیادہ محکم و واضح، حاوی اور بلند پایہ ہے، بلکہ اس کا اختیار کرنا، اس پر کلی اعتماد، اور اس کے نتیجے اور مطالبے کو تسلیم کرنا ضروری ہے، خواہ وہ ان مفاہیم کے مطابق ہو جو نزول قرآن سے پہلے اہل عرب میں پائے جاتے تھے، یا ان کے خلاف[1]"

اس کے بعد انھوں نے قرآن مجید سے اس کی مثالیں دی ہیں، جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں[2] اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"کیا یہ حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے درست ہوگا کہ جب عرب مختلف و متفرق قبائل

---

[1] دعاۃ لا قضاۃ ص۱۹-۲۰ [2] ایضاً ملاحظہ ہو ص۲۰ تا ۲۵

میں بٹے ہوئے تھے، اور ان میں سے ہر ایک کی ذیلی زبان (بولی و انداز گفتگو) الگ الگ تھا، وہ کسی ایک حکومت، ثقافت و تہذیب، اور یکساں عقائد کے جھنڈے کے نیچے نہیں تھے، وہ ایک ناخواندہ قوم تھے، جن میں ایسے افراد شاذ و نادر پائے جاتے تھے، جو پڑھنے لکھنے کے فن سے کسی قسم کی راہ و رسم رکھتے ہوں، ان سب پر جہالت و انحطاط کا تاریک سایہ تھا، ان کے ہاتھوں میں کوئی آسمانی کتاب نہ تھی، نہ کسی علم و فن پر ان کو دسترس تھی، جب وہ اس پست حال میں تھے، تو "الٰہ" و "رب" "عبادت" و "دین" کے صحیح مفاہیم ان کے یہاں شائع و ذائع تھے، ان کا ہر فرد ان سے یکساں طریقہ پر آشنا اور ان کی معین اور غیر مشتبہ اور غیر مشترک حقیقت سے آگاہ تھا، لیکن جب اللہ کی کتاب اس ذکر کے ساتھ نازل ہو گئی جس کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" اور جو ہر قسم کی خارجی دست و برد اور رخنہ اندازی سے محفوظ ہے، "لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ" جس کے بیان میں کسی قسم کا ابہام اور جس کی وضاحت میں کسی قسم کا نقص نہیں ہے، جس کی رات دن کی تلاوت سے لاکھوں کروڑوں بندگان خدا اپنے مالک کا قرب و رضا حاصل کرتے ہیں، اور جس کو ان نمازوں میں بالجہر پڑھتے ہیں، جو بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ مساجد اور اپنے گھروں میں پڑھتے ہیں، تو وہ معانی پردۂ خفا میں چلے گئے، اور امت ان کی دولت سے محروم ہو گئی، وہ لوگوں میں اس طرح مشہور و رائج نہیں رہے، جیسا کہ وہ زمانۂ جاہلیت میں معروف و مشہور تھے، کیا اتنا بڑا دعویٰ اس حالت میں زیب دیتا ہے کہ اللہ کی کتاب مسلمانوں کے درمیان موجود و محفوظ ہے، اور ان میں سے کوئی شخص بھی سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص، یا معوذتین پڑھ یا سن لے، وہ ان حقیقتوں کو سمجھ لے گا اور ان معانی تک پہونچ جائے گا، جن کی زمانۂ جاہلیت کے آدمی کو ہوا بھی نہیں لگی تھی"۔

مصنف کا یہ دعویٰ کہ :۔

"اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے، ان کے لئے "الٰہ" "رب" اور "دین" و "عبادت" کے وہ معنی باقی نہ رہے تھے، جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے"

بالکل ایک بے دلیل دعویٰ اور ایک بے سند الزام ہے، جس پر کسی عمارت کی بنیاد قائم نہیں کی جا سکتی، ہم نے قرآن مجید کی جن آیات کو بطور نمونہ پیش کیا ہے، ان سے الوہیت و ربوبیت کے معنی متعین ہو جاتے ہیں، مفسرین نے بھی کسی دور میں بھی (علی سبیل المثال) "رب" کے معنی میں سے کسی ایک معنی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے ہر موقعہ پر اس کلمہ کی وہی تشریح کی ہے جو سیاق و سباق کے مطابق تھی[1]

اس کے بعد انھوں نے آیات قرآنی نقل کر کے رب کے مختلف قرآنی معانی واضح کئے ہیں، اس کے بعد عبادت اور دین کی بھی تشریح قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں کی ہے۔

پھر انھوں نے مولانا کی اس عبارت کو نقل کرتے ہوئے کہ "عرب میں "جب قرآن پیش کیا گیا تھا، اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ "الٰہ" کے کیا معنی ہیں، اور "رب" کسے کہتے ہیں، کیونکہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے، انھیں معلوم تھا، کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے، اس لئے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا "الٰہ" اور "رب" ہے، اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، تو پوری بات کو پا گئے، انھیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہو گیا کہ دوسروں کے لئے کس چیز کی نفی کی جا رہی ہے، اور اللہ کے لئے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے، لکھا ہے کہ:-

"اگر اس گفتگو کا مقصد بالاطلاق اس کا حکم لگانا ہے کہ بعثت نبویؐ کے وقت نجد و حجاز میں ہر عرب نے معین اور واضح طریقہ پر آپ کی دعوت کا مفہوم سمجھ لیا تھا، اور وہ "الٰہ" و "رب"

---

[1] ایضاً ص ۲۵۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں ان الفاظ کو سمجھا اور ان کے صحیح مفہوم کو پیش کیا گیا ہے، البتہ صرف ایک معنی پر حصر نہیں کیا گیا۔ (مصنف)

کے مفہوم، حقیقت توحید، اور مختصر اشہادت "لاالٰہ الا اللہ" کے مکمل مفہوم پر حاوی تھا تو ایسے دعوے کی صحت پر دلیل کی ضرورت ہوگی، اور اس کے لئے یہ دعویٰ کافی نہیں ہے، کہ الٰہ و رب کا مطلب اس وقت کے عربی بولنے والوں میں شائع اور معروف تھا، کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے ان سب کی مردم شماری کی ہے، اور ان میں سے فرداً فرداً وہ ہر ایک کے حالات سے واقف ہے، پھر جبکہ نجد و حجاز وغیرہ کے باشندے سب کے سب خالص عربی النسل لوگ بھی نہیں تھے، جن کی مادری زبان عربی ہو، ان میں سے ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی، جو عرب میں رہ بس گئے تھے، ایک بڑی تعداد ان غلاموں کی تھی، جو مختلف ممالک و اقوام سے تعلق رکھتے تھے، اور باہر سے لائے گئے تھے، ان میں بہت سے غیر ملکی آزاد لوگ تھے، جن کی زبان عجمی تھی، تاریخ نے بھی بہت سے ایسے صحابہ کے نام محفوظ کردیئے ہیں، جو ایرانی النسل، رومی الاصل، یا حبشی نژاد تھے، اور قرآن مجید نے اس آیت کے ذریعہ جزیرۃ العرب میں ان کی موجودگی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:

"لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ"[1]

عالم اسلام و تاریخ اسلام کی تاریک تصویر

جب مولانا بے تکلف اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں کے اصلی معنیٰ جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، باقی نہ رہے، اور ان کے مفہوم پر ایسا پردہ پڑ گیا کہ قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہوگئی تو پھر قدرتاً امت کی پوری پچھلی تاریخ ان کو زوال و پستی کا ایک لامتناہی

---

[1] سورۃ النحل ۱۰۳۔ دعاۃ لا قضاۃ صفحہ ۳۰

سلسلہ اور تاریخ اسلام کی درمیانی صدیاں (جن میں پیدا ہونے والے متعدد "جزئی" مجددین کے کارناموں کا انھوں نے اعتراف کیا ہے) عقیم اور ویران نظر آنے لگیں، اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں عالم اسلام کے کسی کسی گوشے میں اصلاح حال اور دینی جد و جہد کی بجلیاں کوند جاتی تھیں "كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا"

اس طریق فکر کا قدرتی اور منطقی نتیجہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحابہ و تابعین کے دور[1] کے بعد کے عالم اسلام کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ ایک حساس اور تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان کے دل میں (جس کو اسلام کی علمی و فکری، اور اصلاحی و تجدیدی تاریخ کے وسیع و عمیق مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا) اسلامی تعلیمات کی ابدیت، اسلام کی مردم خیزی و آدم گری اور درخت اسلام کی شادابی اور پُرثمری کے بارے میں شک و شبہ، اور اس کے یقین میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ کسی درجہ میں مایوسی اور احساس کہتری کا شکار ہونے لگتا ہے، اور اس کو ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ اس "کشت ویراں" کی مٹی نم ہونے کے بعد بھی زرخیز نہیں ہو سکتی۔

ناظرین ان سطور کو پڑھتے وقت شاید محسوس کریں کہ مولانا کے بارہ میں قدرے زیادتی اور ناانصافی سے کام لیا گیا ہے، ممکن ہے ان کے دل میں یہ بات آئے کہ مسلمانوں کے تمام مصلحین نے اپنے اصلاحی کام کی بنیاد اسلامی معاشرے کی تنقید اور اپنے عہد کے ماحول سے شدید بے اطمینانی پر رکھی، جیسے امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب "الرد علی البکری" اور "الرد علی الاخنائی" میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے پُرتاثیر خطبات و مواعظ میں، اور شاہ ولی اللہؒ اور ان کے نامور پوتے

---

[1] ان کی تحریروں سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ صحابہ و تابعین کا دور بھی کلی طور پر معیاری و مثالی نہیں ہے۔

مولانا اسماعیل شہیدؒ نے اپنی تحریروں میں یہی سخت ناقدانہ اسلوب اختیار کیا ہے، مگر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ان حضرات کی تنقیدیں صرف ان کے زمانے اور ماحول تک محدود تھیں پوری تاریخ اسلام اور امت اسلامیہ کے تمام ادوار و امصار کے متعلق نہ تھیں، ان دونوں اسلوبوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

جس شخص کے قلم سے بھی ایسی تحریر نکلے جس سے یہ غلط تأثر پیدا ہوتا ہو کہ تاریخ اسلام تاریک و ویران، امت محمدیہ تخلیقی صلاحیت سے محروم رہی ہے، اور عالم اسلام میں تاریکی اور انحراف و گمراہی کا دور دورہ رہا ہے تو اس شخص کے فیصلے کو جلد بازی کا فیصلہ اور اصلاح و تجدید کی تاریخ سے نامکمل واقفیت پر محمول کیا جائے گا، خود راقم السطور اپنے کو اپنی ابتدائی تحریروں میں اس غلطی کے ارتکاب سے مستثنیٰ نہیں کرتا جو فکری پختگی اور تاریخ کے قدرے وسیع و اختصاصی تحقیق و مطالعہ سے پہلے لکھی گئی تھیں[1]، مصنف کو مذکورہ غلط فہمی کا احساس تھا جب اس نے اپنی مشہور کتاب "مسلمانوں کے عروج و زوال سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا؟" تصنیف کی تو عنوان "دعوت و تجدید کا تسلسل" کے ماتحت اس نے حسب ذیل مضمون کا اضافہ ضروری سمجھا۔

"لیکن واضح رہے کہ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے، وہ اس پوری مدت میں ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے محفوظ رہا، مسلمانوں نے راہِ راست سے جہاں جہاں انحراف

---

[1] جیسا کہ مصنف کی مشہور اور برصغیر ہند و پاک میں کثیر الاشاعت کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" میں سید صاحبؒ کا زمانہ (۵۵-۵۸) کے عنوان کے تحت لکھا گیا تھا، مگر یہ بھی جاننا چاہئے کہ یہ کتاب مصنف کی اولین تصنیف ہے اور اس کے قلم سے جب یہ کتاب اور اس کی یہ فصل نکلی اس وقت اس کی عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔

کیا تھا، کتاب وسنت سے مقابلہ کر کے اس کا علم اور احساس ہو جاتا تھا، دین و شریعت نے مسلمانوں کی غلطی میں کبھی ساتھ نہیں دیا، بلکہ ان کے مطالعہ سے غیر اسلامی ماحول، مشرکانہ اور مبتدعانہ اعمال و رسوم اور جاہلی اخلاق و عادات کے خلاف، نیز طبقۂ امراء اور گروہ سلاطین کے تعیش اور استبداد کے خلاف ایک سخت احتجاج اور جذبۂ جہاد پیدا ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور اور اسلامی دنیا کے ہر گوشے میں ایسے عالی ہمت اور اولوالعزم اشخاص پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اس امت میں انبیاء کی جانشینی کا حق ادا کیا، مسلمانوں کے تنِ مردہ میں روحِ جہاد پھونکی اور برسوں کی ساکن سطح میں حرکت و تموج پیدا کیا۔ [1] الخ

پھر "جاہلیت کے لئے رکاوٹ" کے عنوان کے تحت لکھا تھا۔

"لیکن مسلمان اپنی ساری خرابیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اور اپنے انحراف کے باوصف اپنی تمام معاصر جاہلی قوموں کے مقابلہ میں انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی شاہراہ سے قریب تر، اور خدا کے زیادہ مطیع و فرماں بردار تھے، ان کا وجود، ان کا رہا سہا اقتدار، جاہلیت کے لئے پھیلنے اور ترقی کرنے میں بڑی زبردست رکاوٹ اور سدِ سکندری کا کام دے رہا تھا، وہ اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود دنیا کی ایک اہم طاقت تھے، جس سے حکومتیں خائف رہتی تھیں اور جس کی ان کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی۔" [2]

---

[1] "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ص۲۰۱

[2] ایضاً ص۲۰۹

مصنف نے اپنے پہلے عاجلانہ تأثر کے ازالہ کے لئے اپنی مفصل کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" لکھی[1] جس میں اسلام کی دینی وفکری اور معاشرتی تاریخ اور تجدیدی واصلاحی کوششوں کا مبسوط جائزہ پیش کیا، عالم اسلام کے مختلف رہنماؤں اور ان تحریکوں کے علمبرداروں کا مفصل تعارف کرایا، اور اس کے مقدمے میں یہ صراحت کی کہ اسلام میں اصلاح وتجدید کی تحریک ایک تسلسل کے ساتھ موجود رہی ہے، اور اس کے درمیان کوئی تعطل وبے عملی کا طویل وقفہ نہیں ملتا۔

امت کی تاریخ پر تنقیدی مضمون کو سپرد قلم کرتے ہوئے مولانا کا زور قلم بہت بڑھ جاتا ہے، اور ان میں اپنے معروف انداز نگارش سے الگ خطیبانہ اور رجزیہ انداز پیدا ہوجاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"تقریباً تین صدیوں تک تحقیق واجتہاد، اور حریت فکر ونظر، اور آزادانہ طلب حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی، جس کو نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تبعین میں پیدا کر گئے تھے، اس کے بعد امراء وحکام، اور علماء ومشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا شروع کردیا، سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق، اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کرلیا گیا، درباروں سے ———

---

[1] یہ کتاب اردو میں تین جلدوں میں اور عربی دو جلدوں میں ہے، چوتھی جلد زیر تصنیف ہے۔

لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی، دل اور دماغ کی غلامی، روح اور جسم کی غلامی ان پر پوری طرح مسلط ہوگئی، دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کراکے غلامانہ ذہنیت پیدا کی، مدرسہ والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اتارا، خانقاہ والوں نے "بیعت" کے مسنون طریقہ کو مسخ کرکے مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لئے کبھی ایجاد نہ کیا ہوگا، جب غیر اللہ کے سامنے زمین تک سر جھکنے لگیں، جب غیر اللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اٹھاکر دیکھنا سوء ادبی ہو جائے، جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چومے جانے لگیں جب انسان انسان کا خداوند و مالک اور اَن داتا بن جائے، جب انسان بذات خود امر و نہی کا مختار، اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی سند سے بے نیاز قرار دیا جائے، جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بری اور عیب سے منزہ سمجھ لیا جائے، جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی عملاً اسی طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے، تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس دعوت سے منہ موڑ لئے گئے جو "اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کے الفاظ میں دی گئی تھی، اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی، روحانی ترقی ممکن ہی نہیں، پستی اور زوال اس کا لازمی نتیجہ ہے"۔[1]

انھوں نے جہاں اپنی کتاب "تجدید و احیاء دین" میں تاریخ اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں اور ان کے علمبرداروں کی خدمات و مساعی کا جائزہ لیا ہے، وہاں بھی صاف

---

[1] تفہیمات ج اول، شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ص ۱۳۷-۱۳۸

لکھدیا ہے کہ :-

"تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا ہے، قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبہ یا چند شعبے ہی میں کام کیا، مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے"[1]

اہل حق کی موجودگی اور احادیث صحیحہ میں غلبۂ حق کی مساعی کے تسلسل و دوام کی پیشین گوئی

تاریخ کے مطالعہ کا یہ نتیجہ، اور انداز فکر ان صریح و صحیح احادیث کے مضمون اور روح کے خلاف ہے، جن میں اطلاع دی گئی ہے کہ اس امت کو دنیا میں کام کرنے کا جو وقت دیا گیا ہے اس کا کوئی مختصر سے مختصر وقفہ بھی ایسا نہ ہوگا جو حق کے علمبرداروں، اور اس کے لئے جدوجہد کرنے والوں سے یکسر خالی ہوگا، بخاری و مسلم کی روایت ہے۔

لا یزال ناس من امتی ظاھرین حتی یاتیھم أمر اللہ وھم ظاھرون[2]

میری امت کے کچھ لوگ برابر غالب اور سربلند رہیں گے اور اللہ کے حکم (قیامت) کے آنے تک ان کی فتحیابی و سربلندی قائم رہے گی۔

ترمذی کی حدیث ہے :-

لا تزال طائفۃ من أمتی منصورین لا یضرھم من خذلھم حتی تقوم

میری امت میں ایک گروہ برابر کامیاب و بامراد رہے گا اور ان کا ساتھ نہ دینے والے ان کو

---

[1] تجدید و احیاء دین ص۳۱ (مطبوعہ مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام پٹھان کوٹ پنجاب)

[2] صحیح بخاری، کتاب المناقب۔

الساعة۔[۱]	کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، اور یہ صورت حال قیامت تک برقرار رہے گی۔

ابن ماجہ کی روایت میں اس سے زیادہ صاف الفاظ آئے ہیں:۔

لا تزال طائفة من أمتي قوامة على أمر الله لا يضرها من خالفها۔[۲]	میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ دین کے معاملہ اور احکام الٰہی کے عمل و اجرا میں مستعد و سرگرم رہے گا، اور اس کی مخالفت کرنے والے اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔

ترمذی کی ایک دوسری روایت ہے:۔

مثل أمتي مثل المطر لا يدري أخره خير أم أوله۔[۳]	میری امت کی مثال بارش کی ہے اور بارش کے متعلق یہ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا آخر کا حصہ بہتر ہے یا شروع کا؟

مستدرک حاکم کی روایت ہے:۔

لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق حتى تقوم الساعة۔[۴]	میری امت کا ایک گروہ حق کے سلسلہ میں برابر کامیاب و فتحیاب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

تاریخ اسلام میں اصلاح و تجدید کی کوششوں کا تسلسل

خود تاریخ کا دیانت دارانہ اور وسیع و عمیق مطالعہ (جو عرفی و تقلیدی تاریخ کی کتابوں

۱؎ جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی الشام ۲؎ سنن ابن ماجہ۔ کتاب الفتن۔

۳؎ جامع ترمذی ۴؎ مستدرک حاکم۔

اور مشہور و متداول مطبوعات میں محدود نہ ہو) اس بات کی تردید کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اصلاح و تجدید کی کوششیں، جاہلیت اور ظلمت سے کشمکش، باطل تحریکوں، وقت کے فتنوں، اسلام پر اندرونی و بیرونی حملوں، دشمن اسلام طاقتوں کی سازشوں، اعتقادی و فکری ضلالتوں، علمی و اخلاقی انحرافات و بے عنوانیوں سے نبرد آزمائی اور ان کے مقابلہ میں صف آرائی کا سلسلہ، جوہر اسلام اور روح اسلام کو مصفیٰ اور منقح پیش کرنے کی کوشش غیر منقطع اور مسلسل طریقہ پر جاری رہی، اس سلسلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی جفاکش اور بلند ہمت طالب علم جس نے اس کو اپنے غور و مطالعہ کا موضوع بنایا ہے، اگر پورے احساس ذمہ داری و فرض شناسی کے ساتھ اس کا دعویٰ کرے کہ اس طلائی زنجیر کی ہر کڑی پہلی کڑی سے پیوست ہے اور اس کی کوئی کڑی گم نہیں ہے تو اس کو محض خوش اعتقادی اور امت کو ذہنی فریب دینے کا الزام ہرگز نہیں دیا جاسکتا، یہ دراصل تاریخ اسلام کا نقص نہیں، تاریخ نویسی کا نقص ہے[1]، اور کسی موضوع پر مکمل و مرتب شکل میں کسی تاریخی دستاویز کا موجود نہ ہونا اس کا ہرگز ثبوت نہیں کہ اصل واقعات و مواد اور تاریخی شہادتیں بھی ناپید ہیں، یہ علمی و تحقیقی تاریخ کا ایک ایسا تجربہ ہے جس سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں، اور تاریخ پر کام کرنے والوں کو بار بار سابقہ پڑا ہے، تاریخ کی زبان اور پیرایۂ بیان سے ذرا ہٹ کر منطق و کلام کی زبان میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے یہ الفاظ ایک علمی حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں کہ "عدم علم عدم وجود کو مستلزم نہیں" یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا علم نہ ہو وہ چیز سرے سے موجود ہی نہ ہو، اگر ان اصلاحی و تجدیدی کوششوں کے تسلسل کا کسی ایسے فاضل کو علم نہیں جس کو اس کے مخصوص حالات، ذوق طبیعت اور مشاغل

---

[1] راقم سطور کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" (جس کے اس وقت تک تین حصے شائع ہوئے ہیں) اس سلسلہ کی ایک حقیر کوشش ہے، اس کی تکمیل کے بعد یہ حقیقت اور بھی زیادہ عیاں ہو کر سامنے آجائے گی۔

نے اس موضوع پر اختصاصی طریقہ پر مطالعہ کا موقعہ نہیں دیا تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ یہ اصلاحی و تجدیدی کوششیں سرے سے ہوئی نہیں۔

سلبی و منفی طرز فکر کا نفسیاتی اثر

امت اسلامیہ کی مردم خیزی، اسلام کے شجرۂ طیبہ جو "تُؤْتِيٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍۭ بِإِذْنِ رَبِّهَا"[1] کا مصداق ہے، کی بار آوری کا انکار اسلام اور مسلمانوں کی طویل تاریخ میں جو تجدیدی و انقلابی کوششیں مسلسل طریقہ پر کی جاتی رہی ہیں، ان کی طرف سے صرف نظر، یا ان کی اہمیت کم کرنے کی کوشش، تاریخ اسلام کو سیاہ عینک سے دیکھنے کی عادت عموماً ان باطل فرقوں، اور انتشار انگیز داعیوں کی حکمت عملی (TECHNIQUE) یا جنگی حکمت (STRATEGY) رہی ہے جو تاریخ اسلام اور فکر اسلامی کے ملبہ ہی پر اپنی عمارت تعمیر کرنے کی گنجائش سمجھتے ہیں، اور جن کا خیال ہے کہ جب تک اس تمام تاریخی ذخیرے کے بارے میں بے اعتمادی، اور ذہن میں اس کی حقارت پیدا نہ ہو ان کے "اجتہاد و تحقیق" کی قدر و قیمت ذہنوں میں جاگزیں نہیں ہو سکتی، اور ان کی تحریک و دعوت کے لئے سازگار فضا تیار نہیں ہو سکتی اس سلسلہ میں کئی تحریکوں اور فرقوں کے بانیوں کا نام لیا جا سکتا ہے، لیکن ہم مولانا مودودی کے بارے میں یہ گمان نہیں کرتے کہ انھوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت یہ حکمت عملی اختیار کی ہے، لیکن ان کی نیت اس بارے میں کتنی ہی غیر مشتبہ ہو، اس طریق کار کا طبعی اور قدرتی نتیجہ نکلنا ناگزیر ہے، اور جیسا کہ کوئی شخص بد پرہیزی کر کے مؤاخذۂ اخروی سے خواہ بچ جائے، لیکن اس کا اثر اس کے نظام صحت، اور جسم پر پڑنا ضروری ہے، جو لوگ صرف مولانا مودودی کی تحریروں کے مطالعہ پر اکتفا کرتے ہیں، اور جنھوں نے

---

[1] سورۂ ابراہیم آیت ۲۵۔ ترجمہ: "وہ درخت ہر وقت اللہ کے حکم سے اپنے پھل دیتا رہتا ہے۔"

اسلام، اسلامی دعوت و تعلیمات، اور اسلامی تاریخ کو تنہا انھیں کی تحریروں اور مضامین سے سمجھا ہے، وہ تاریخ اسلام مسلمانوں کے دور ماضی، قرون ثلاثہ کو مستثنیٰ کر کے بعد کی صدیوں کے نتائج فکر و عمل، اور ان کے حاصل و ثمرات سے اتنے مایوس ہیں کہ ان کی زبان حال ان میں سے کسی کا نام سن کر بھی حالیؔ کے الفاظ میں گویا ہو سکتی ہے کہ ؎

ہم نے سب کا کلام[۱] دیکھا ہے
ہے ادب شرط! منہ نہ کھلوائیں!

حاکمیت "الٰہ و رب" پر انحصار

مولانا مودودی کے نزدیک قرآن کی ان چاروں بنیادی اصطلاحات کا اصل محور اور ان کا مرکزی نقطہ، "حاکمیتِ الٰہ و رب" ہے، اور ان کے نزدیک "دین" و "عبادت" دونوں اسی نقطہ پر لانے کے خطوط اور راستے ہیں، الٰہ کی اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"بس الوہیت کی اصل روح اقتدار ہے، خواہ وہ اقتدار اس معنی میں سمجھا جائے کہ نظام کائنات پر اس کی فرماں روائی فوق الطبیعی نوعیت کی ہے، یا وہ اس معنی میں تسلیم کیا جائے کہ دنیوی زندگی میں انسان اس کے تحت امر ہے، اور اس کا حکم بذات خود واجب الاطاعت ہے، یہی اقتدار کا تصور ہے، جس کی بنیاد پر قرآن اپنا سارا زور غیر اللہ کی الٰہیت کے انکار اور صرف اللہ کی الٰہیت کے اثبات پر صرف کرتا ہے"۔[۵۲]

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

۱؎ کلام کی جگہ پر یا اس کے ساتھ کام کا لفظ بڑھایا جا سکتا ہے۔

۵۲؎ "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" شائع کردہ دارالاشاعت، نشاۃ ثانیہ، حیدر آباد، ص ۱۹

"ان تمام آیات میں اول سے آخر تک ایک ہی مرکزی خیال پایا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ الہٰیت واقتدار لازم وملزوم ہیں، اور اپنی روح ومعنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں، جو اقتدار نہیں رکھتا وہ الٰہ نہیں ہوسکتا، اور اسے الٰہ نہ ہونا چاہئے، اور جو اقتدار رکھتا ہے وہی الٰہ ہوسکتا ہے، اور اسی کو الٰہ ہونا چاہیئے، کیونکہ الٰہ سے تمہاری جس قدر ضروریات متعلق ہیں یا جن ضروریات کی خاطر تمہیں کسی کو الٰہ ماننے کی حاجت پیش آتی ہے ان میں سے کوئی ضرورت بھی اقتدار کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی، لہٰذا غیر مقتدر کا الٰہ ہونا بے معنی ہے، حقیقت کے خلاف ہے اور اس کی طرف رجوع کرنا لاحاصل ہے"[1]

"رب" اور ربوبیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان آیات کے سلسلہ وار پڑھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ قرآن ربوبیت کو بالکل حاکمیت اور سلطانی (SOVEREIGNTY) کے ہم معنی قرار دیتا ہے"[2]

وہ صاف صاف اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ رب کی اصل تعریف اقتدار اعلیٰ ہے، اور عبادت وعبودیت اس اقتدار اعلیٰ کی اطاعت تعمیل حکم اور وفاداری کا نام ہے، نبی اس مقتدر اعلیٰ کا نمائندہ ہے، اور اسی حیثیت سے اس کے حکم کی اطاعت ضروری ہے، انسانوں کی حیثیت بس اس مالک الملک کی رعیت کی ہے جس کو اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو اس مالک کے ساتھ مخصوص کردینا چاہیئے، سورۂ آل عمران کی آیت اور حضرت عیسیٰ کی اس تلقین کہ "اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ" کی تفسیر کرتے ہوئے انھوں نے خالص یہی (سیاسی) زبان وتعبیر استعمال کی ہے، فرماتے ہیں:۔

"اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی

---

[1] ایضاً ص ۲۵ [2] ایضاً ص ۷۵

بنیادی نکات یہی تین تھے۔

ایک یہ کہ اقتدار اعلیٰ جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لئے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اس مقتدر اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیئے جائیں۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلے اللہ علیہم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مو فرق نہیں ہے، جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیئے ہیں، اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے، انھوں نے سخت غلطی کی ہے، مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا، اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ مقتدر اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔"[۱]

پھر وہ اقتدار اور حاکمیت کی وسعت و وحدت کو بیان کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں، کہ کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھنے اور شرک باللہ میں کوئی فرق نہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ اقتدار اور حاکمیت ناقابل تقسیم ہے، اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے

[۱] نوٹ نمبر ۴۸۔ تفہیم القرآن جلد اول ص ۲۵۴-۲۵۵ شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ۱۹۶۹ء

حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو ویسا ہی شرک کرتا ہے جیسا ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے، اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک، اور مقتدر اعلیٰ، اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، تو اس کا یہ دعویٰ بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے، جس طرح فوق الطبیعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ تمہارا ولی اور کارساز، اور مددگار و محافظ میں ہوں، اسی لئے جہاں خلق اور تقدیر اشیاء، اور تدبیر کائنات میں اللہ کے لاشریک ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں "لَهُ الْحُكْمُ" اور "لَهُ الْمُلْكُ" اور "لَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ" بھی کہا گیا ہے، جو اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ ربوبیت کے مفہوم میں بادشاہی و حکمرانی کا مفہوم بھی شامل ہے، اور توحید الٰہ کے لئے لازم ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے بھی اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کی جائے۔"[1]

سید قطب کی ملتی جلتی تصریحات

راقم سطور کے عزیز و فاضل دوست اور مصر کے مشہور اہل قلم سید قطب شہید بھی جو مولانا مودودی کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" سے بہت متاثر، اور اس سے پورے طور پر متفق ہیں، حاکمیت کو الوہیت کا اخص خصائص بتاتے ہیں، ان کی تحریر سے بھی جاہلیت کی اصنام پرستی یا غیر اللہ کی عبادت کی شناعت کم ہوتی ہے، وہ اس کو جاہلیتِ قدیم کی ایک ابتدائی اور سادہ (مشرکانہ) صورت قرار دیتے ہیں، اپنی مشہور کتاب "معالم فی الطریق" میں لکھتے ہیں:۔

هذه الجاهلية تقوم على أساس	اس (جدید) جاہلیت کی بنیاد زمین میں

---

[1] ایضاً ص ۲۷-۲۸

الاعتداء على سلطان الله في الأرض،	اللہ کے اقتدار اور الوہیت کے اخص خصائص
وعلى أخص خصائص الألوهية بوهي	(یعنی حاکمیت) پر دست درازی پر قائم ہے،
الحاكمية: إنها تسند الحاكمية إلى البشر	یہ حاکمیت کا سزاوار بشر کو قرار دے کر
فتجعل بعضهم لبعض أربابا، لا في الصورة	بعض انسانوں کو بعض کا رب تسلیم کرتی ہے
البدائية الساذجة التي عرفتها الجاهلية	یہ کام اس ابتدائی اور سادہ طریق پر نہیں
الأولى، ولكن في صورة ادعاء حق وضع	ہوتا جیسا کہ قدیم جاہلیت کا دستور تھا، بلکہ
التصورات والقيم، والشرائع والقوانين	یہ اس بات کی دعویدار ہے کہ بشر کو مستقلاً
والأنظمة والأوضاع بمعزل عن منهج	(الٰہی نظام حیات سے الگ اور اللہ کی مرضی
الله للحياة، وفيما لم يأذن به الله.[1]	کے خلاف) تصورات و اقدار، شرائع و قوانین
	اور نظام و فلسفہ کے وضع کرنے کا حق حاصل ہے

وہ انسانوں کو انسانوں کا حاکم سمجھنے، اور ان کے بنائے ہوئے قوانین پر چلنے کو "عبادت" ہی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں :-

فالناس في كل نظام غير النظام الإسلامي	(خلاصہ یہ ہے کہ) اسلامی نظام کے علاوہ
يعبد بعضهم بعضاً۔ في صورة من الصور	سارے نظاموں میں کسی نہ کسی شکل میں انسان
ـــ وفي المنهج الإسلامي وحده يتحرر	انسان کی پرستش کرتا ہے، اور اسلامی نظام
الناس جميعاً من عبادة بعضهم	اور صرف اسلامی نظام کے تحت سارے
لبعض لعبادة الله وحده، والتلقي	انسان آپس میں ایک دوسرے کی پرستش
من الله وحده، والخضوع لله وحده[2]	سے یکسر آزاد ہو کر تنہا خدا کو اپنا معبود تسلیم

[1] معالم في الطريق ١٣٨٦ھ - ١٩٦٧م ، ص۸۹ [2] ایضاً ص۹۳

کرتے، اسی کے اوامر و نواہی پر چلتے اور اسی
کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں۔

آگے چل کر ان عربوں کا ذکر کرتے ہوئے جو قرآن مجید کے مخاطب اول تھے، لکھتے ہیں:۔

كانوا يعرفون أن الألوهية تعني الحاكمية العليا، وكانوا يعرفون أن توحيد الألوهية وإفراد الله سبحانه بها، معناه نزع السلطان الذي يزاوله الكهان ومشيخة القبائل والأمراء والحكام، ورده كله إلى الله[1]	وہ جانتے تھے کہ الوہیت عبارت حاکمیت اعلیٰ (اقتدار اعلیٰ) سے ہے، اور الوہیت کی وحدانیت اور اس کا سزاوار تنہا خدا کو قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ جس حاکمیت پر کاہنوں، قبائل کے سرداروں، اور امراء و حکام نے قبضہ جما رکھا ہے اسے ان سے چھین کر تمام تر خدا کے حوالہ کر دیا جائے۔

آگے چل کر اس سے بھی زیادہ صفائی سے لکھتے ہیں:۔

كانوا يعلمون أن لا إله إلا الله ثورة على السلطان الأرضي الذي يغتصب أولى خصائص الألوهية، وثورة على الأوضاع التي تقوم على قاعدة من هذا الاغتصاب، وخروج على السلطات التي تحكم بشريعة من عند ها لم يأذن بها الله[2]	وہ جانتے تھے کہ "لا الٰہ الا اللہ" اس زمینی حاکمیت کے خلاف ایک بغاوت ہے جو الوہیت کے اخص خصائص کی غاصب ہے، اور ان نظاموں کے خلاف بغاوت ہے جو اس قبضۂ غاصبانہ پر قائم ہیں، نیز ان تمام حکومتوں اور اقتداروں کے خلاف بغاوت ہے جو اس قانون کو جاری کرتے ہیں جس کی اللہ نے

---

[1] ایضاً ص۲۲ [2] ایضاً ص۲۲

اجازت نہیں دی۔

لا الٰہ الا اللہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

لا إله الا الله كما يدركه العربي العارف بمدلولات لغته: لاحاكمية إلا لله، ولا شريعة إلا من الله، ولا سلطان لأحد على أحد، لأن السلطان كله لله[1]	"لا الٰہ الا اللہ" کا مطلب ایک عرب کی نگاہ میں جو اپنی زبان کے الفاظ کے صحیح معنی ومفہوم سے واقف ہوتا ہے یہ ہے کہ حاکمیت صرف خدا کے لئے ہے، اور شریعت صرف خدا کی تسلیم کی جائے گی، اور کسی پر کسی کو حاکمیت کا حق حاصل نہیں، کیونکہ حاکمیت کی تمام تر حق دار تنہا ذات الٰہی ہے۔

وہ حاکمیت کو اللہ کے ساتھ مخصوص کرنے کو لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مفہوم (مدلول حقیقی) سمجھتے ہیں، اور بس، اسی کتاب میں ایک جگہ یہ بیان کرتے ہوئے کہ جو لوگ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، یا جن کے اسلام کا ثبوت صرف پیدائش کے رجسٹروں سے ملتا ہے، ان کو حقیقی اسلام کی تعلیم کی ضرورت ہے، لکھتے ہیں:۔

يجب أن يعلموهم أن الإسلام هو أولاً۔ اقرار عقيدة: لا إله الا الله بمدلولها الحقيقي۔ وهو رد الحاكمية لله في أمرهم كله، وطرد المعتدين على سلطان الله بادعاء هذا الحق لأنفسهم[2]	ان کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلام۔ اولاً۔ "لا الٰہ الا اللہ" کے عقیدہ کو اس کے حقیقی مدلول کے ساتھ تسلیم کرنے کا نام ہے، یعنی یہ کہ اپنے سارے معاملات میں وہ صرف خدا کی حاکمیت تسلیم کریں، اور جو لوگ اس حاکمیت

---

[1] ایضاً ص ۲۵ [2] ایضاً ص ۳۵

کا دعویٰ کرتے اور اس پر دست درازی کرتے

ہیں انھیں دھتکار دیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

إن إعلان ربوبية الله وحده للعالمين' معناه: الثورة الشاملة على حاكمية البشر في كل صورها و أشكالها، وأنظمتها وأوضاعها، والتمرد الكامل على كل وضع في أرجاء الأرض، الحكم فيه للبشر بصورة من الصور.... أو بتعبير آخر مرادف: الألوهية فيه للبشر في صورة من الصور[1]	سارے عالم کے لئے تنہا خدا کی ربوبیت کے اعلان کا مطلب ہے بشر کی حاکمیت (چاہے وہ جس شکل و صورت اور نظام و فلسفہ میں جلوہ گر ہو) کے خلاف بھرپور بغاوت' اور دنیا کے ہر گوشے میں اس صورت حال کے خلاف سرکشی و برگشتگی جس میں حاکمیت (یا دوسرے ہم معنی لفظوں میں: الوہیت) کا حق کسی نہ کسی شکل میں انسان کو حاصل ہو۔

حاکمیت کو الوہیت وربوبیت کا نقطۂ مرکزی اور اخص خصائص تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ زندگی کے کسی معاملہ میں بھی کسی انسانی قانون کی پیروی اور اس کو تسلیم کرنے کو منافی دین اور شرک فی الحاکمیت (جو شرک فی الالوہیت یا شرک فی الربوبیت کا ان حضرات کے نزدیک مرادف ہے) قرار دے دیا جائے۔

سید قطب "فی ظلال القرآن" میں تفسیر سورۂ یوسف کے سلسلہ میں "ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ" پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وهذا وحده هو الدين القيم فلا دين	محض یہی دین قیم ہے ـــــ اور جب تک

---

[1] ایضاً ص۵۹

اذن لله مالم تكن دينونة الناس لله وحده ومالم يكن الحكم لله وحده، ولا عبادة لله اذا دان الناس لغير الله في شان واحد من شئون الحياة فتوحيد الألوهية يقتضي توحيد الربوبية، والربوبية تتمثل في أن يكون الحكم لله أو أن تكون العبادة لله فهما مترادفان أو متلازمان، والعبادة التي يعتبر بها الناس مسلمين أو غير مسلمين هي الدينونة والخضوع والإتباع لحكم الله دون سواه[1]

لوگ صرف خدا کے تابع نہیں ہوتے اور صرف اسی کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے "دین" کا کوئی مطلب نہیں اور نہ اللہ کی پرستش کا کوئی مطلب ہے اگر لوگ زندگی کے کسی بھی معاملہ میں غیر اللہ کے تابع رہتے ہیں (تو انکی خدا کی تابعداری نامکمل اور غیر معتبر ہے) اس لئے کہ الوہیت کی وحدانیت خود ربوبیت کی وحدانیت کی متقاضی ہے اور ربوبیت کے دو ہی مظاہر ہیں: اللہ کی حاکمیت، اللہ کی پرستش، اس طرح یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ہم معنی یا ایک دوسرے کو لازم ہیں، وہ عبادت جس کی رو سے لوگ مسلمان یا غیر مسلم سمجھے جائیں گے وہ تنہا خدا کی حاکمیت کی مکمل تابعداری، اطاعت اور اتباع ہے۔

آگے چل کر اس سے نتیجہ نکالتے ہیں:-

فهذا الاعتبار يعدّ من المعلوم من الدين بالضرورة من دان لغير الله وحكّم في أي أمر من أمور حياته

"دین" کی یہ تعریف دین کی ایک بدیہی و قطعی حقیقت ہے، جو غیر اللہ کی بڑائی تسلیم کرتا ہے اور زندگی کے کسی.... معاملہ میں بھی غیر اللہ کو

---

[1] فی ظلال القرآن" جزء ۱۲ ص ۲۰۰

غیر اللہ فلیس من المسلمین ولیس فی ھذا الدین، ومن أفرد اللہ سبحانہ بالحاکمیۃ ورفض الدینونۃ لغیرہ من خلائقہ فھو من المسلمین وفی ھذا الدین۔[1]

حکم مانتا ہے، وہ نہ تو مسلمان ہے اور نہ اس دین ہی سے اس کا کوئی تعلق ہے، لیکن جو صرف خدا کی حاکمیت پر ایمان رکھتا ہے، اور اللہ کی مخلوق میں سے کسی کی تابعداری کے لئے تیار نہیں، اور نہ اس کے سامنے جھکتا ہے وہ مسلمان ہے اور اس دین میں داخل۔

ایک غلو اور اس کی تردید

معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں اس خیال اور اس کی تفصیل و تطبیق میں ایسا غلو پیدا ہو گیا تھا کہ استاذ ہضیبی کو اس کی تردید کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ اپنی سابق الذکر کتاب "دعاۃ لاقضاۃ" میں مولانا مودودی کے نظریہ "اللہ کی حاکمیت" کی تشریح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"بعض لوگوں کو اس سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مولانا مودودی کے نزدیک یہ بات محال ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس کی اجازت دے کہ وہ اپنے لئے ایسی تنظیمات یا قانون وضع کریں جو ان کی زندگی کے کسی شعبہ کو منظم یا منضبط کرتے ہوں"۔[2]

استاذ ہضیبی مولانا کے لئے اس کو بعید از قیاس قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ہماری دنیاوی زندگی کے بہت سے امور آزاد چھوڑ دیئے ہیں جن کو جیسا ہماری عقل رہنمائی کرے ان عمومی مقاصد اور ان معین غایات کے حدود کے اندر جو خدا نے مقرر کر دی ہیں، اور جن کی تکمیل کا ہم کو مکلف کیا ہے،"

---

[1] ایضاً صـ۲۰۰ [2] دعاۃ لاقضاۃ صـ۷۲

ہم منظم کریں اس شرط کے ساتھ کہ ہم کسی حرام کو حلال اور کسی حلال کو حرام نہ کریں۔[1]"

پھر وہ کہتے ہیں کہ:۔

"شریعت میں تین چیزیں ہیں، فرض، حرام اور مباح، جس کو شریعت نے فرض و حرام قرار دیا وہ قیامت تک فرض و حرام رہے گا، لیکن جہاں تک مباحات کا تعلق ہے مسلمانوں کو اس کا اختیار ہے کہ وہ ان کے بارے میں وہ نظام وضع کریں جن کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، اور جن کا تعلق ان اجتماعی ضروریات اور مفاد عامہ سے ہے، جن کے بارے میں شرعی نصوص وارد ہوئی ہیں، اسی قبیل میں سے شوریٰ کے قوانین ہیں، جو نص قرآنی "وأمرهم شورىٰ بينهم" کی تعمیل ہے، اسی طرح سے سڑکوں پر گذرنے کے قوانین (TRAFFIC CONTROL) کا نظام ہے حفظان صحت کے ضوابط، کھیتی کو نقصان پہونچانے والی چیزوں کا مقابلہ، آبپاشی کا نظام، تعلیمی ضوابط، پیشوں اور مختلف صنعتوں کو منظم کرنے کے قواعد و ضوابط، انتظامیہ، فوج، شہروں کی پلاننگ اور تعمیرات وغیرہ کے قاعدے اور ضابطے جو کسی بلدیہ یا حکومت کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں، سب اس میں داخل ہیں، اور جن کے رہنما اصول یا ان مقاصد جو ان قواعد کے واضعین کے پیش نظر ہوتے ہیں، کی اہمیت کی طرف رہبری ہم کو سنت اور عمل صحابہ میں ملتی ہے۔[2]"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"اس سے اس قول کا بطلان ظاہر ہے کہ مطلق قانون سازی خواہ وہ معمولی امور میں ہو صرف اللہ کی صفت اور اس کا منصب ہے، اور جس نے کوئی قانون وضع کیا، اس نے اپنے لئے خدا کی صفت اختیار کرلی، اور اپنے کو خدا کا ہمسر اور باغی بنا دیا۔[3]"

---

[1] ایضاً ص۳۰، [2] ایضاً ص۴۳-۴۴، [3] ایضاً ص۴۴

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اتنی بڑھ گئی کہ بعض لوگ ان مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھنے لگے جو مطلق کسی کا قانون قبول کرلیں، اور بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا عقیدہ فاسد اور وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں، اس لئے کہ وہ ان اکثر قوانین سے ناواقف ہیں، جو اللہ نے ان کی سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی تنظیم کے لئے مقرر کئے ہیں، ان کی اکثریت یہ سمجھنے لگی ہے کہ اللہ کی شریعت کے احکام عبادات میں محدود ہیں انھوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"عام لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ حکام و منتظمین کو ان قوانین اور تنظیمات کے وضع اور جاری کرنے کا اختیار ہے، جو (اصولاً) کتاب و سنت کے نصوص کی بنیاد پر اور ان کی روشنی میں ہوں، اور جو ان کی سیاسی اقتصادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تنظیم کرتی ہوں، یہ عقیدہ ہے جس میں کفر و شرک کا کوئی شائبہ نہیں، بلکہ وہ اپنی جگہ پر حق ہے۔"[۱]

کیا انسان اور خدا کا تعلق محض حاکم و محکوم کا ہے؟

اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے کہ کیا کسی کو مستقلاً واجب الاطاعت سمجھنا بالکل ایسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ سے دعا مانگنا، اس سے پہلے ہم پڑھنے والوں کی توجہ اس پر منعطف کرنا چاہتے ہیں کہ ان عبارتوں بلکہ مصنف کی پوری کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" اور ان کی بکثرت تحریروں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان کا اصل تعلق اور رشتہ، حاکم و محکوم کا رشتہ، اور رعیت و حکومت کا تعلق ہے، اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ میں اصل حیثیت اس کے مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کی ہے،

---

[۱] ایضاً ص ۷۹

اور گویا انبیا علیہم السلام کی بعثت، صحف سماوی کے نزول، اور دعوت و تبلیغ کا اصل مقصد و مدعا بس خدا کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرانا، اور اس کے مطابق زندگی گذارنا ہے، یہ بات خدا پر ایمان لانے اور اسلام کو قبول کرنے کا کیسا ہی لازمی نتیجہ اور اسلام کا قدرتی مطالبہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کے اپنی مخلوقات سے تعلق، اور مخلوقات کے اس کے ساتھ تعلق کا ایک جز، اور بہت محدود جز ہے، کُل اور عظیم کُل نہیں، درحقیقت خالق و مخلوق، اور عبد و معبود کا تعلق، حاکم و محکوم، اور آمر و مامور، اور ایک بادشاہ اور رعیت کے تعلق سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ عمیق، کہیں زیادہ لطیف، اور کہیں زیادہ نازک ہے، قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کو جس تفصیل کے ساتھ، اور جتنے دل آویز طریقہ پر بیان کیا ہے، اس کا مقصد قطعاً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بندہ سے صرف اتنا مطلوب ہے کہ وہ اس کو اپنا حاکم اعلیٰ اور آمر مطلق سمجھ لے، اور اس کے اقتدار اعلیٰ میں کسی کو شریک نہ کرے، مثال کے طور پر سورۂ حشر کے آخری رکوع میں حسب ذیل آیات پڑھی جائیں:۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ عَالِمُ	وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں
الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ	پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، وہ بڑا مہربان
الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا	نہایت رحم والا ہے، وہی خدا ہے جس کے سوا
هُوَۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ	کوئی لائق عبادت نہیں، بادشاہ حقیقی پاک
الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُؕ سُبْحٰنَ	ذات (ہر عیب سے) سالم، امن دینے والا نگہبان
اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ	غالب، زبردست، بڑائی والا، خدا ان
الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰىؕ	لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے، وہی
یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِۚ	خدا (تمام مخلوقات کا) خالق ایجاد و اختراع

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (سورۃ الحشر ۲۲-۲۴)

کرنے والا، صورتیں بنانے والا، اس کے سب اچھے سے اچھے نام ہیں، جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتی ہیں، اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

اسماء وصفات وافعال الٰہی کا تقاضا و مطالبہ

ان اسماء صفات، اور ان افعال الٰہی کے ذکر کا جن سے قرآن شریف بھرا ہوا ہے، صاف تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دل وجان سے محبت کی جائے، اس کی طلب و رضا میں جان کھپا دی جائے، اس کی حمد وثنا کے گیت گائے جائیں، اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے، اسی کی دھن ہر وقت دل و دماغ میں سمائی رہے، اسی کے خوف سے انسان ہر وقت لرزاں اور ترساں رہے، اسی کے سامنے دست طلب ہر وقت پھیلا رہے، اسی کے جمالِ جہاں آرا پر ہر وقت نگاہیں جمی رہیں، اسی کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے ...مٹا دینے حتیٰ کہ سر کٹا دینے کا جذبہ بیدار رہے، جن لوگوں نے اس کے صفات اور استحقاقات میں سے صرف اس کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ ہی کو اس کا اصل حق اور مطالبہ سمجھا، ڈر ہے کہ کہیں وہ "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" کے مصداق نہ بنیں، قرآن مجید نے فلسفہ ہائے قدیم کے برخلاف (جنھوں نے نفیِ صفات میں تفصیل اور تدقیق سے کام لیا، اور اثبات ذات میں اجمال و اختصار سے) ذات باری جل مجدہٗ کے اثبات و تعریف و تشریح میں تفصیل و توسع سے کام لیا ہے، بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ "قرآن مجید نے نفی میں اجمال اور اثبات میں تفصیل سے کام لیا ہے" نفی میں اس نے اس قول قاطع پر اکتفا کیا کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" لیکن اثبات میں اس کا وہ انداز ہے

جو سورۂ حشر کی آیات میں دیکھا گیا، اور یہ سب اسی وجہ سے کہ تعلق و وابستگی، اور محبت و فریفتگی، صفات کے علم و معرفت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی، انبیا علیہم السلام اور خاص طور پر سید الانبیا، جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی، آپ کا عمل اور تعلیم، آپ کی دعا، اور نماز کی کیفیت، ابتہال و تضرُّع، اِنابت واِخبات، محبت الٰہی کا جوش، یاد الٰہی کا انہماک، اس کے ذکر سے تسکین، اور اس کے نام کی حلاوت ولذت، پھر صحابۂ کرام اور عارفین امت کی زندگی میں اس کا جلوہ، اس سب میں انھیں صفات کا پرتو نظر آتا ہے، اور اس بات کا نتیجہ ہے کہ وہ اللہ کو محض حاکم اعلیٰ اور آمر مطلق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ ان کے نزدیک معبود حقیقی کے ساتھ محبوب حقیقی، اور جمال وجلال و کمال کا مبدا و منتہا ہے۔

عبودیت و الٰہ کی تعریف شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے یہاں

خود شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (جو مشائخ طریقت میں نہیں تھے، اور جو بہت سے حضرات کے نزدیک محدث خشک اور عالم ظاہر تھے) عبودیت کے لئے جو الٰہ اور رب کا فطری حق ہے، تنہا اطاعت اور تذلل کو کافی نہیں سمجھتے جو عام طور پر اس ہستی کے لئے اختیار کی جاتی ہے، جس کے حاکم اور مقتدر اعلیٰ ہونے کا عقیدہ پایا جاتا ہے، اور وہ ہستی بھی عام طور پر اس کو کافی سمجھتی ہے، اور اس پر قناعت کرتی ہے، وہ عبودیت کے لئے خضوع و تذلل کے ساتھ کمال محبت کو بھی شرط قرار دیتے ہیں، جو حکومت و اقتدار کے علاوہ ایسی صفات و کمالات کو چاہتا ہے جس سے وہ ہستی "عابد" و "عبد" کی نظر میں کمال محبت کی مستحق ہو، وہ اپنے مشہور رسالہ "العبودیۃ" میں لکھتے ہیں:-

لکن العبادۃ المامور بہا تتضمن — لیکن وہ عبادت جس کا (شریعت کی طرف سے)

عنی الذل ومعنی الحب، فھی تتضمن غایۃ الذل للہ تعالیٰ بغایۃ المحبۃ لہ۔[1]

حکم دیا گیا ہے، اس میں تابعداری ومحبت دونوں داخل ہیں، اس طرح عبادت کے مفہوم میں اللہ کی مکمل تابعداری کمال محبت کے ساتھ داخل ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

..... ومن خضع لإنسان مع بغضہ لہ لایکون عابداً لہ، ولو أحب شیئاً ولم یخضع لہ لم یکن عابداً لہ کما قد یحب الرجل ولدہ وصدیقہ ولھذا لایکفی أحدھما فی عبادۃ اللہ تعالیٰ، بل یجب أن یکون اللہ أحب إلی العبد من کل شئ وأن یکون اللہ أعظم عندہ من کل شئ۔[2]

اگر کوئی کسی کے ساتھ بغض رکھتے ہوئے اس کا تابع رہتا ہے تو وہ اس کی پرستش کرنے والا نہیں سمجھا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی کسی چیز سے محبت تو کرتا ہے لیکن اس کی بڑائی تسلیم نہیں کرتا تو وہ اس کی پرستش کرنے والا نہیں مانا جائے گا جیسے انسان کی محبت اپنی اولاد سے یا اپنے دوست سے، اسی لئے اللہ کی عبادت کے سلسلہ میں ان دونوں میں سے تنہا کوئی ایک بات کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ بندہ کے نزدیک اللہ ہر چیز سے زیادہ محبوب اور ہر چیز سے زیادہ بڑا ہو۔

وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ "الالٰہ" کی تشریح کرتے اور اس کا اشتقاق بتاتے ہوئے

---

[1] العبودیۃ لشیخ الإسلام ابن تیمیۃ طبع المکتب الإسلامی ۱۹۶۳ء ص ۶ [2] ایضاً ص ۷

لکھتے ہیں:۔

الإلٰہ ھو الذی یألھہ القلب بکمال	الہ وہ ہے جس کی طرف دل کا میلان
الحب والتعظیم والإجلال،	کمال محبت، اور نہایت تعظیم واحترام
والإکرام والخوف والرجاء	واکرام خوف ورجاء، اور اس طرح کی
ونحو ذلک۔[1]	دیگر کیفیات کے ساتھ ہو۔

ان کی ایک دوسری عبارت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبد ومعبود کا تعلق محض حاکم ومحکوم کا نہیں ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور جامع ہے، اس تعلق میں معرفت، انابت، محبت، اخلاص، اور ذکر سب شامل ہے، حالانکہ حاکم کے لئے صرف خضوع اور تذلل اور طاعت وانقیاد کافی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

ان اللہ خلق الخلق لعبادتہ	اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس لئے پیدا کیا ہے
الجامعۃ لمعرفتہ، والإنابۃ إلیہ	تاکہ وہ اس کی عبادت کریں، اور عبادت
ومحبتہ، والإخلاص لہ فبذکرہ	میں اللہ کی معرفت، اس کی طرف انابت
تطمئن قلوبھم، وبرؤیتہ فی الآخرۃ	اس کے ساتھ محبت واخلاص سبھی کو داخل
تقر عیونھم، ولاشیٔ یعطیھم فی	ہے، چنانچہ اللہ کے ذکر سے ہی بندے کو
الآخرۃ أحب إلیھم من النظر إلیہ	اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے، اور آخرت
ولاشیٔ یعطیھم فی الدنیا أعظم من	میں اس کی رویت سے ان کی آنکھوں کو
الایمان بہ۔[2]	ٹھنڈک نصیب ہوگی، آخرت میں اللہ بندوں
	کو اپنے دیدار سے ان کے لئے محبوب تر

---

[1] رسالۃ العبودیۃ ص ۱۲ [2] مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام أحمد بن تیمیۃ ج اول ص ۲۳ طبع ۱۳۸۱ھ

کوئی چیز نہیں دے گا، اور نہ دنیا میں اللہ

نے اپنے بندوں کو ایمان سے بڑی کوئی

دولت دی ہے۔

آگے چل کر اسی عبادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ولا صلاح لھم ولا فلاح ولا نعیم ولا لذۃ یدون ذلك بحال بل من أعرض عن ذکر ربه فإن له معیشة ضنکا ونحشرہ یوم القیامة أعمی[1]

اس کے بغیر بندے کو کسی حال میں نہ صلاح وفلاح نصیب ہو سکتا ہے اور نہ وہ کسی نعمت ولذت سے آشنا ہو سکتے ہیں کیونکہ جو اپنے رب کی عبادت سے پہلوتہی کرے گا اس کو (دنیا میں بھی) زندگی کی تنگی سے دوچار ہونا پڑے گا، اور قیامت کے دن اس کو نابینا اٹھایا جائے گا۔

یہ تعریف الٰہ کی اس تعریف سے کتنی مختلف ہے جس میں اصل حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو قرار دیا گیا تھا، اور جس کا ترجمہ خود مولانا مودودی نے ساورن (SOVEREIGN) سے کیا ہے، ظاہر ہے کہ ضابطہ کے اس الٰہ کے لئے نہ محبت ضروری ہے، نہ کثرت ذکر، اس کو تو اپنے محکوم کی صرف اطاعت کلی اور وفاداری (LOYALTY) چاہیے۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت وتعلیم کا اصل مقصد توحید کی دعوت اور شرک کا استیصال ہے

مولانا یہ ثابت کرتے ہوئے کہ اقتدار اور حاکمیت ناقابل تقسیم ہے، فرماتے ہیں کہ:۔

---

[1] ایضاً ص۲۳

"اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو ایسا ہی شرک کرتا ہے جیسا ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے، اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، تو اس کا یہ دعویٰ بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے، جس طرح فوق الطبیعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ تمہارا ولی اور کارساز اور مددگار و محافظ میں ہوں[1]"

اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ اشراک فی الحکم اور اشراک فی الالوہیۃ یا فی العبادۃ دونوں ایک ہی مرتبہ اور حیثیت کے شرک ہیں، اور یہ کہ سیاسی طور پر کسی کو حاکم و آمر ماننا اور مابعد الطبعیاتی طور پر کسی کو قابل عبادت، مستحق دعا و نذر و قربانی، اور خوف و رجا سمجھنا بالکل ایک درجہ کے شرک ہیں، بلکہ مولانا کی توجہ کا اصل مرکز و موضوع یہی سیاسی اطاعت کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنا، اس کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھنا، اس کو قانون سازی کا اختیار دینا ہے، اور اسی پر ان کا زور قلم صرف ہوا ہے، جن لوگوں کا مطالعہ انھیں مضامین اور تحریروں تک محدود ہوگا، اور جو اسی ماحول میں ذہنی و فکری نشو و نما حاصل کریں گے قدرۃً ان کی نظر میں اسی اشراک فی الحکم کی اولیت و اہمیت جاگزیں ہو جائے گی، اور اگر دوسرے عوامل و مؤثرات، تربیت و تعلیم نہیں ہے، تو اشراک فی العبادۃ، اور مابعد الطبعیاتی طور پر کسی کو لائق استعانت و عبادت، تضرع و دعا، سجدہ اور ان چیزوں کا جو غایت تعظیم کا مظہر ہیں، مستحق سمجھنے کی شناعت اور اس کی نفرت کم ہو جائے گی، یا وہ سمجھنے لگے گا کہ یہ قدیم دور جاہلیت کی خصوصیات تھیں، جب عقل انسانی اپنے دورِ طفولیت میں تھی، علم و تمدن ابتدائی منزل پر تھے، اب زمانہ ترقی کر گیا ہے، اب اس پر

---

[1] قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۲۷-۲۸

توجہ کرنا، اس کی تردید و ازالہ کے درپے ہونا، اور اس کے مقابلہ میں صف آرائی، وقت اور قوت کی اضاعت اور اہم کو چھوڑ کر غیر اہم میں مشغول ہونے کے مرادف ہے۔

اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں عقیدہ، اور عبد و معبود کے باہمی تعلق کی تصحیح، اور صرف ایک کی بندگی کی دعوت، ہر زمانہ اور ہر ماحول میں انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور ان کے خلفاء و نائبین کی پہلی دعوت اور ان کا سب سے بڑا اور اہم مقصد رہا ہے، ہمیشہ ان کی تعلیم یہی رہی ہے کہ اللہ ہی نفع و نقصان پہونچانے کی طاقت رکھتا ہے، اور صرف وہی عبادت، دعا، توجہ اور قربانی کا مستحق ہے، ان کے بھرپور حملہ کا رخ اپنے زمانہ میں جاری و ساری "وثنیت" کی طرف رہا ہے، جو مورتیوں اور مقدس و صالح زندہ و مردہ شخصیتوں کی پرستش کی صورت میں جلوہ گر تھی، ان ہستیوں کے بارے میں اہل جاہلیت کا اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت و عظمت اور معبودیت کے خلعت سے سرفراز فرمایا ہے، ان کو خاص خاص امور میں تصرف کا اختیار بھی دے رکھا ہے، اور انسانوں کے بارے میں وہ ان کی سفارشوں کو علی الاطلاق قبول فرماتا ہے، جیسے شہنشاہ اعظم ہر علاقہ کے لئے ایک حاکم بھیج دیتا ہے، اور (بعض بڑے اور اہم امور کے علاوہ) علاقہ کے انتظام کی ساری ذمہ داری انھیں کے سر ڈال دیتا ہے۔

جس شخص کو قرآن سے کچھ بھی تعلق ہے (جو تمام پچھلی کتابوں کی تعلیمات کا جامع ہے) اس کو یقینی اور بدیہی طور پر یہ بات معلوم ہوگی کہ اس شرک و بت پرستی کے خلاف صف آرائی، اس سے جنگ کرنا، اس کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرنا، اور لوگوں کو اس کے چنگل سے نجات دلانا، نبوت کا بنیادی مقصد تھا، انبیاء کی بعثت کی اصل غرض، ان کی دعوت کی اساس، ان کے اعمال کا منتہیٰ اور ان کی جد و جہد کی غایت اصلی تھی، اور یہی ان کی زندگی

اور ان کی دعوت کا اصل مرکز تھا، ان کی سرگرمیاں اسی کے گرد گھومتی تھیں، وہ یہیں سے آگے بڑھتے تھے، اور یہیں واپس لوٹتے تھے، یہیں سے اپنا کام شروع کرتے تھے، اور پھر یہیں آکر ختم کرتے تھے، قرآن کبھی تو ان کے بارے میں اجمالاً کہتا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ	اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی
اِلَّا نُوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا	طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود
فَاعۡبُدُوۡنِ[۱]	نہیں، تو میری ہی عبادت کرو۔

اور کبھی تفصیل کے ساتھ ایک ایک نبی کا نام لیتا ہے، اور بتلاتا ہے کہ اس کی دعوت کی ابتدا اسی توحید کی دعوت سے ہوئی تھی[۲]۔

قرآن نے اسی "بت پرستی" کو "شرک اکبر" "گندگی" اور "جھوٹی بات" کا نام دیا ہے، اور بڑی کراہت و نفرت کے ساتھ اس کے معائب بیان کئے ہیں، چنانچہ سورۂ حج میں ہے۔

ذٰلِكَ وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ	یہ ہمارا حکم ہے اور جو شخص ادب کی چیزوں کی
فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ وَاُحِلَّتۡ	جو خدا نے مقرر کی ہیں، عظمت رکھے، تو یہ
لَـكُمُ الۡاَنۡعَامُ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ	پروردگار کے نزدیک اس کے حق میں بہتر ہے
فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ	اور تمہارے لئے مویشی حلال کر دیئے گئے ہیں
وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِۙ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ	سوا ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں،
غَيۡرَ مُشۡرِكِيۡنَ بِهٖؕ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ	تو بتوں کی ناپاکی سے بچو اور جھوٹی بات سے
بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ	اجتناب کرو، صرف ایک خدا کے ہو کر

---

[۱] انبیاء ۲۵ [۲] مثال کے طور پر سورۂ ہود کی آیات ۲۵-۲۶-۵۰-۶۱-۸۴، سورۂ انبیاء کی آیات ۵۱-۵۴، سورۂ شعراء کی ۶۹-۸۲، سورۂ مریم کی ۴۱-۴۲، عنکبوت کی ۱۶-۱۷-۲۵ سورۂ یوسف کی ۳۷-۴۰، سامنے رکھی جائیں۔

فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِيۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِيۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ ۝[۱]

اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا کر، اور جو شخص کسی کو خدا کے ساتھ شریک مقرر کرے تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے، پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔

اسوۂ انبیاء و مزاج نبوت

نبوت اور جو دین وہ لے کر آتی ہے، ان دونوں کا یہی مزاج ہے کہ نبی کی نظر میں سب سے بڑھ کر قابل نفرت اور ناقابل برداشت چیز یہی معبودان باطل اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بت ہوتے ہیں، جن کے سامنے انسان سجدہ ریز ہوتے ہیں، اور ان کے ساتھ دعا، تضرع، نذر و نیاز، قربانی کا معاملہ کرتے ہیں، جو خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں کرنا چاہئے، چنانچہ جیسے ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے، اور آپ کو وہاں وہ سب اختیارات حاصل ہوئے، جو اس سے پہلے حاصل نہیں ہوئے تھے، تو آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ کعبہ میں داخل ہوئے، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، خانۂ خدا اور اس کے گرد تین سو ساٹھ بتوں کا جمگھٹا تھا، آپ کمان سے ایک ایک پر ضرب لگاتے اور فرماتے۔

وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا ۝[۲]

اور کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا، بیشک باطل نابود ہونے والا ہے۔

---

[۱] الحج ۳۰-۳۱ [۲] بنی اسرائیل ۸۱

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ○[1] — کہہ دو کہ حق آچکا اور (معبود) باطل نہ تو پہلی بار پیدا کرسکتا ہے اور نہ دوبارہ پیدا کرے گا۔

یہ سب بت منہ کے بل گرتے جاتے اور سرنگوں ہوتے۔[2]

مکہ فتح ہو جانے کے بعد آپ نے ان تمام بتوں کی طرف مسلمانوں کی جماعتیں بھیجیں جو کعبہ کے چاروں طرف دور دور تک پھیلے ہوئے تھے، انھیں میں "لات" و "عزّیٰ" اور "منات" جیسے عہد جاہلیت کے مرکزی اور محبوب بت تھے، جن کی پرستش کے لئے عرب کے کونے کونے سے لوگ آتے تھے، آپ کی طرف سے ایک منادی نے مکہ میں یہ اعلان کیا کہ "جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے گھر میں کوئی بت ہو اس کو بے توڑے نہ چھوڑے" آپ نے کچھ صحابہ کو قبائل کی طرف بھیجا انھوں نے وہاں کے بتوں کے توڑنے کا فرض انجام دیا[3] حضرت جریر ابن عبد اللہ کہتے ہیں، جاہلیت میں ایک بت خانہ تھا جس کو "ذوالخلصہ" "کعبۂ یمانیہ" اور "کعبۂ شامیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، تم "ذوالخلصہ" کو توڑ کر میرے دل کو آرام نہ پہونچاؤ گے؟ میں یہ سن کر احمس کے ڈیڑھ سو سواروں کو لے کر گیا، ہم نے اس بت کو پاش پاش کر دیا، اور وہاں اس کے پجاری اور پروہت موجود تھے، ان کو ختم کر دیا، اور واپس آکر آپ کو اس کی اطلاع دی، آپ یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور ہمارے لئے اور احمس کے لئے دعائے خیر فرمائی،[4] نبوت کا یہ ایک ایسا مقصد اولین تھا کہ جب قبیلہ ثقیف نے اسلام لانے کے بعد

---

[1] سبا ۴۹۔ [2] صحیح بخاری "باب این رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم الرایۃ یوم الفتح" تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "زاد المعاد" ج ا ص ۴۲۴ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "زاد المعاد" ج ا ص ۴۲۶ [4] صحیح بخاری "باب غزوۃ ذی الخلصۃ"

درخواست کی کہ ان کے قومی بت "لات" کو تین سال تک نہ توڑا جائے، تو آپ نے صاف انکار کر دیا، یہاں تک کہ وہ ایک مہینہ پر اتر آئے، مگر آپ نے اس کو بھی منظور نہ فرمایا، اور ابوسفیان اور مغیرہ کو اسی وقت بھیج کر اس کا قلع قمع کروا دیا۔

اس (فوق الطبیعی) شرک اور عبادت غیر اللہ سے کراہت و نفرت کا یہ حال تھا کہ رحلت کے وقت جو آخری الفاظ زبان مبارک سے نکلے ہیں، ان میں یہ ارشاد بھی تھا۔

قاتل اللہ الیھود والنصاری اتخذوا	اللہ یہود و نصاریٰ کو تباہ کرے، انھوں نے
قبور انبیائھم مساجد۔[1]	اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا
	(اور اس کی پرستش شروع کردی تھی)۔

حضرت عائشہ رض کہتی ہیں کہ حالت احتضار میں چہرے پر سے چادر ہٹاتے اور فرماتے:۔

لعنۃ اللہ علی الیھود والنصاریٰ	یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انھوں نے
اتخذوا قبور أنبیائھم مساجد،	اپنے انبیاء کی قبروں کو پرستش گاہ
یحذر ما صنعوا۔[2]	بنالیا تھا۔

فرماتی ہیں کہ "مقصد یہ تھا کہ یہ امت ان کی تقلید نہ کرے اور شرک میں مبتلا نہ ہو"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شرک و عبادت غیر اللہ اور شعائر شرک کے اختیار کرنے کو امتوں اور ملتوں کی پرانی اور دائمی کمزوری اور بیماری سمجھتے تھے، اور اس سے مطمئن نہیں تھے کہ اس کا اعادہ پھر نہیں ہوگا، اس لئے آپ نے اس خطرہ سے آگاہ فرمایا، اور ایسی نازک گھڑی میں بھی اس سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی، اور اس سے اپنی تکلیف کا اظہار فرمایا، یہ گویا اس امت کے لئے ایک پیغام اور اس کے ذمے ایک امانت اور ضروری

---

[1] مؤطا امام مالک [2] صحیح بخاری "باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ووفاتہ"

کام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے، اور اسلام کتنا ہی ترقی کر جائے، یہ خطرہ باقی رہے گا، اور علماء و اصحاب دعوت اور نائبین رسول کا فرض ہے کہ اس کے بارے میں چوکنا رہیں، اور اس کے معاملہ میں کسی رواداری اور رعایت سے کام نہ لیں۔

جواں ہیں لات و منات

یہی بت پرستی اور شرک (یعنی خدا کے علاوہ دوسروں کو معبود بنانا، اور ان کے سامنے انتہائی ذلت اور مسکنت کا اظہار، ان کے سامنے سجدہ ریزی، ان سے دعا اور مدد کی طلب اور ان کے لئے نذر و نیاز) عالمگیر اور ابدی جاہلیت ہے، جو ہر زمانہ میں نہ صرف زندہ و توانا بلکہ جوان رعنا ہے، اور یہی نوع انسانی کی پرانی کمزوری اور قدیم ترین مرض ہے، جو زندگی کے تمام مراحل، تغیرات اور انقلابات میں نوع انسانی کے پیچھے لگا رہتا ہے، اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکاتا ہے، بندوں کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا روڑا بنتا ہے، اور ان کو بلند درجات سے گرا کر عمیق گڑھوں میں ڈال دیتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ	ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں
تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ	پیدا کیا ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کی حالت کو
سَافِلِينَ ۝[1]	بدل کر پست سے پست کر دیا۔

اور یہی جہالت انسانوں کو مسجود ملائک کے بلند و بالا مقام سے گرا کر ضعیف مخلوقات اور ذلیل و بے حقیقت اشیاء کے سامنے سجدہ ریز کر دیتی ہے، اور انسان کی قوتوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے، ان کی صلاحیتوں کا خون کر دیتی ہے، قادر مطلق پر اس کے یقین، اس کی

---

[1] التین ۴-۵

خود اعتمادی اور خود شناسی کا خاتمہ کر دیتی ہے' اور سمیع و بصیر' صاحب قدرت و علم' صاحب جود و عطا' اور مغفرت و محبت والے خدا کی محفوظ و مستحکم پناہ سے نکال کر اور اس کی لامحدود صفات' اور نہ ختم ہونے والے خزانوں کے فوائد سے محروم کر کے' کمزور' عاجز' فقیر اور حقیر مخلوقات کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے' جن کی جھولی میں کچھ نہیں۔

یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَهُ الْمُلْکُ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَکُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَکْفُرُوْنَ بِشِرْکِکُمْ وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ خَبِیْرٍ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ؁[1]

وہی رات کو دن میں داخل کرتا اور وہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے' اور اسی نے سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا ہے' ہر ایک ایک وقت مقرر تک چل رہا ہے' یہی تمہارا پروردگار ہے' اسی کی بادشاہی ہے' اور جن لوگوں کو تم اس کے سوا پکارتے ہو' وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی تو کسی چیز کے مالک نہیں' اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سنیں اور اگر سن بھی لیں تو تمہاری بات کو قبول نہ کر سکیں' اور قیامت کے روز تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے' اور خدائے باخبر کی طرح تم کو کوئی خبر نہیں دے گا' لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو' اور خدا بے پرواہ سزاوار حمد و ثنا ہے۔

---

[1] فاطر ۱۳ – ۱۵

انبیاء کرام کے جہاد و جدوجہد کا اصل موضوع و نشانہ

یہی شرک و بت پرستی (مابعد الطبیعیاتی حدود کے اندر رہی) اپنی تمام واضح اور غیر واضح شکلوں کے ساتھ ہر زمانہ، ہر ماحول، اور ہر معاشرہ میں انبیائے کرام علیہم السلام کے جہاد کا موضوع رہی ہے، اور اسی نے اہل جاہلیت کی آتش غضب کو بھڑکا دیا اور وہ چیخ پڑے۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ٥ وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ ٥ مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ ٥[1]	کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا دیا یہ تو بڑی عجیب بات ہے تو ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے اور بولے کہ چلو اور اپنے معبودوں کی پوجا پر قائم رہو، بیشک یہ ایسی بات ہے جس سے تم پر شرف و فضیلت مقصود ہے، یہ پچھلے مذہب میں ہم نے کبھی سنی ہی نہیں، یہ بالکل بنائی ہوئی بات ہے۔

اور جس صاحب عقل و فہم نے بھی عہد نبوی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اور صحابہ کرامؓ کے حالات سے باخبر ہے، اس کو اس امر میں ذرا بھی شبہ نہ ہوگا کہ ہماری پیش کی ہوئی آیتوں سے صحابہ کرامؓ یہی عریاں وثنیت، مورتیوں اور بتوں کی کھلی پرستش، گذرے ہوئے یا موجود اشخاص کی تقدیس و تعظیم، ان کے سامنے سجدہ ریزی، ان کے لئے نذر و نیاز، ان کے

---

[1] ص ۵ - ۷

ناموں کی قسمیں، ان کی عبادت سے اللہ کے قرب کا حصول، ان کی شفاعت پر یقین کامل اور ان سے نفع و نقصان اور مصائب کے ازالہ کی درخواست وغیرہ ہی سمجھتے رہے ہیں، اور ان کے اسالیب کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اور اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔

اور یہی قیامت تک کے لئے دینی دعوتوں اور اصلاحی تحریکوں کا بنیادی رکن اور نبوت کی ابدی میراث ہے :-

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ	اور یہی بات ابراہیم اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝[۱]	تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔

اور یہی تمام مصلحین، مجاہدین، اور اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کا شعار رہے گا۔

شرک جلی اور سیاسی اطاعت و حکومت میں فرق ضروری ہے

رہے جاہلیت کے دوسرے مظاہر، جیسے غیر اللہ کی اطاعت، ان کی قوت حاکمہ کو تسلیم کرنا، غیر الٰہی قوانین کو قبول کرنا، اور ایسی حکومت کو تسلیم کرنا، اور اس کے احکام و قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کرنا جو خلافت الٰہیہ کی بنیادوں پر قائم نہ ہوئی ہو، تو یہ سب اس بت پرستی اور شرک کے تابع ہے، اور اس کا درجہ اس کے بعد ہے، یہ دین میں ایک طرح کی تحریف ہوگی کہ سابق الذکر شرک جلی کی اہمیت کو کم کر دیا جائے، اور دعوت و تبلیغ کے بنیادی اصولوں میں اس کو ضمنی حیثیت دی جائے، یا سیاسی اطاعت و حکومت کو اور اس کو ایک درجہ میں رکھا جائے، اور دونوں پر ایک ہی حکم لگایا جائے یا یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ مشرکانہ اعمال و عبادات گذشتہ قدیم جاہلیت کی خصوصیات

---

[۱] زخرف ۲۸

میں سے ہیں، جن کا زمانہ گذر چکا، اور دور ختم ہو چکا، یہ واقعہ اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے، یہ شرک و عبادت غیر اللہ اپنی تمام قدیم شکلوں کے ساتھ آج بھی زندہ اور موجود ہے، بزرگوں کے مزارات اور مشاہد پر شرک جلی کی شکلوں کو بچشم سر دیکھا جا سکتا ہے، جاہلیت قدیمہ اور ملل سابقہ کی کوئی بے راہ روی، غلو اور غیر اللہ کی تعظیم و تقدیس، رکوع و سجود، نذر و ذبح، دعا و سوال، خوف و رجا، اور ادب و حیا (جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے) کی کوئی شکل ایسی نہیں ہے، جو وہاں علانیہ موجود نہ ہو[1]۔ اس کے علاوہ یہ خیال کہ یہ ایک قصۂ ماضی ہے، انبیائے کرامؑ کی دعوت، ان کی جد و جہد اور ان کی مقدس کوششوں کے حق میں بھی بداندیشی اور قرآن (جو آخری اور ابدی کتاب ہدایت ہے) کی ابدیت میں بھی شک و شبہ کے مترادف ہوگا، اور اس ایمان و اعتقاد میں بے یقینی کے ہم معنی ہوگا، کہ انبیائے کرامؑ کا طریق کار ہی بہترین طریق کار ہے، جس کو اللہ نے پسند فرمایا ہے، اور اس کے لئے اس قدر تائید و توفیق، کامیابی و کامرانی اور بارآوری مقدر فرمائی ہے، جتنی کسی بھی دوسرے اصلاحی طریق کار کے لئے نہیں۔

ربوبیت و الوہیت کی اصل روح اقتدار اور حاکمیت مان لینے کے بعد عبادات کی حیثیت

مولانا مودودی کے نزدیک جب ربوبیت کی اصل روح اقتدار ہے، اور الوہیت و اقتدار .... لازم و ملزوم ہیں، اور بقول ان کے اپنی روح و معنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں[2]، اور یہ کہ قرآن ربوبیت کو بالکل حاکمیت و سلطانی (SOVEREIGNTY) کے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی "الرد علی البکری" اور "الرد علی الاخنائی" شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم"

[2] قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ ص ۱۹-۲۵

ہم معنی قرار دیتا ہے[1]، تو پھر اب عبادت (جو عبد کے کرنے کا کام ہے) کا مفہوم اور اس کی اصل حقیقت اطاعت وانقیاد اور وفاداری (LOYALTY) رہ جاتی ہے، ربوبیت والوہیت کے مرکزی نقطہ، اس کے اخص خصائص (اقتدار) اور اس کے اس واحد مفہوم وحقیقت کا ان پر اس طرح غلبہ ہوا کہ ان کی نظر میں (یا محتاط الفاظ میں ان کی تحریروں میں) عبادت کے ان افعال، مظاہر وشعائر کی اہمیت خود بخود کم ہو گئی جو شریعت میں مشروع، دین میں مطلوب اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبوب تھے، اور جن کے بارے میں ترغیب وتحریض کی بیسیوں آیتیں، اور سیکڑوں احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، ان میں مسابقت وتنافس، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے، ان کی کثرت کرنے والوں اور ان کا اہتمام رکھنے والوں کا ذکر مقام مدح میں کیا گیا ہے، اور ان سے غفلت برتنے والوں کی مذمت کی گئی ہے ان کو لازماً وہ ثانوی درجہ کی چیزیں نظر آنے لگیں، اور ان میں انہماک وتوغل ان کو روح دین سے ناواقفیت کا نتیجہ، اور عہد انحطاط کی یادگار نظر آنے لگا، ان کے اس خیال اور دعوت میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ عبادت کے اس مرکزی نقطہ اور اس کے جوہر کو بیان کرنے کے سلسلہ میں (جس کی اپنی جگہ اہمیت سے کسی کو انکار نہیں) ان عبادات مشروعہ، اور نماز اور ذکر کی کثرت کے بارے میں کسی قدر طنز وتعریض کا رنگ آگیا ہے، جو ان کے عام اسلوب نگارش سے الگ ہے، عبادت کے اجزائے ترکیبی (آقا کی وفاداری اطاعت اور تعظیم) کا ذکر کرتے ہوئے، اور یہ کہ انھیں تین چیزوں کو اللہ نے "عبادت" کے جامع لفظ میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

---

[1] ایضاً ص ۵۷

"عبادت کا یہ مطلب اپنے ذہن میں رکھئے، اور پھر ذرا میرے سوالات کا جواب دیتے جائیے :۔

آپ اس نوکر[1] کے متعلق کیا کہیں گے جو آقا کی مقرر کی ہوئی ڈیوٹی پر جانے کے بجائے، ہر وقت بس اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے، اور لاکھوں مرتبہ اس کا نام جپتا چلا جائے؟ آقا اس سے کہتا ہے کہ جا کر فلاں فلاں آدمیوں کے حق ادا کرو مگر یہ جاتا نہیں، بلکہ وہیں کھڑے کھڑے آقا کو جھک جھک کر دس سلام کرتا ہے، اور پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے آقا اس کو حکم دیتا ہے کہ جا فلاں فلاں خرابیوں کو مٹا دے، مگر یہ ایک انچ وہاں سے نہیں ہٹتا، اور سجدے پر سجدے کئے جاتا ہے، آقا حکم دیتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دے، یہ حکم سن کر بس وہیں کھڑے کھڑے نہایت خوش الحانی کے ساتھ چور کا ہاتھ کاٹ دے، چور کا ہاتھ کاٹ دے بیسیوں مرتبہ پڑھتا رہتا ہے، مگر ایک دفعہ بھی اس نظام حکومت کے قیام.... کی کوشش نہیں کرتا جس میں چور کا ہاتھ کاٹا جا سکے، کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص حقیقت میں آقا کی بندگی کر رہا ہے؟ اگر آپ کا کوئی غلام یہ رویہ اختیار کرے تو میں جانتا ہوں کہ آپ اس سے کیا کہیں گے، مگر حیرت ہے آپ پر کہ خدا کا جو نوکر اس طرح کرتا ہے، آپ اسے بڑا عبادت گذار کہتے ہیں، یہ ظالم صبح سے شام تک خدا جانے کتنی دفعہ قرآن شریف میں خدا کے احکام پڑھتا ہے، مگر ان احکام کو بجا لانے کے لئے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا، بلکہ نفل پر نفل پڑھے جاتا ہے، ہزار دانہ تسبیح پر خدا کا نام جپتا ہے، اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتا رہتا ہے، آپ اس کی یہ حرکتیں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کیسا زاہد و عابد بندہ ہے! یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے ہے کہ آپ عبادت کا صحیح مطلب

---

[1] نوکر کا لفظ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مولانا عبد و معبود اور انسان و خدا کے درمیان کے تعلق اور رشتہ کو حاکم و محکوم بلکہ آقا اور نوکر کے رشتہ سے زیادہ نہیں سمجھتے، آگے چل کر وہ صاف لکھتے ہیں "خدا کا جو نوکر اس طرح کرتا ہے آپ اسے بڑا عبادت گزار سمجھتے ہیں"

نہیں سمجھتے"۔[1]

جو شخص دعوت و اصلاح کی کوششوں سے (جو پہلے دن سے اس وقت تک جاری ہیں) ذرا بھی واقف ہے، اور جس نے راسخ فی العلم اور راسخ فی الدین علماء کی تحریریں دیکھیں، یا تقریریں سنی ہیں، وہ جانتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ نماز و ذکر میں روح و حقیقت پیدا کرنے اور ان عبادات کے ساتھ شریعت کے پورے احکام پر عمل کرنے، اس کو اپنی زندگی میں نافذ کرنے، اور پھر خلق خدا پر اس کے نفاذ و اجرا کی کوشش کی دعوت دی، انھوں نے ایسی زندگی کو جس میں ظاہر و باطن اور جسم و روح میں مطابقت نہ ہو، بلکہ قول و فعل، اور ظاہر و حقیقت میں تضاد ہو، منافقانہ زندگی، اور اس عمل کو نفاق سے تعبیر کیا ہے، اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر اس وقت تک وہ اس سے مسلمانوں کو خبردار کرتے رہے ہیں، ان کی دعوت ہمیشہ "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً"[2] (مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی رہی ہے، لیکن انھوں نے ایسا طرز بیان اختیار نہیں کیا، جس سے ان عبادات و اذکار میں مشغولیت، تسبیح و تحمید، اور تلاوت کی کثرت کی تحقیر یا اس کا استخفاف ہوتا ہو، خاص طور پر ایک ایسے زمانہ میں جب کثرت عبادت و کثرت ذکر کی خود ہی اہمیت کم یا ختم ہوتی جارہی ہے، اور مادی و سیاسی طرز فکر کا غلبہ ہے، اس میں اور بھی احتیاط کی ضرورت تھی، کہ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ کافی ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اعمالِ عبادت کی کثرت کی تعریف و ترغیب

اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں جا بجا ان اعمال کی کثرت کی ترغیب،

---

[1] خطبات حصہ سوم ص۶۰، شائع کردہ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی۔ [2] سورہ بقرہ ۲۰۸

اور ان کی کثرت کرنے والوں کی تعریف آتی ہے، اور ان کا مقام مدح میں بلند الفاظ کے ساتھ تذکرہ ہے، کہیں آتا ہے:۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (سورۂ سجدہ ۱۶)

ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

کہیں ارشاد ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ (سورۂ الفرقان ۶۴)

اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کرکے اور (عجز وادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔

کہیں:۔

وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝ (سورۂ آل عمران ۱۷)

اور اوقات سحر میں گناہوں کی معافی مانگا کرتے ہیں۔

کہیں فرمایا گیا:۔

وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ (سورۃ الاحزاب ۳۵)

اور خدا کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں۔

کہیں حکم ہوتا ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ (سورۃ الاحزاب ۴۲)

اے اہل ایمان خدا کا بہت ذکر کیا کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔

ذکر و انابت، اور مشغولی بحق کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو ایسی پسند ہے کہ وہ اپنے محبوب پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جو افضل الخلائق ہیں، اور جن کی تعلیم ہی سے یہ سعادت انھیں کو میسر آئی ہے، ایسے لوگوں کی قدر و ترجیح کی تاکید فرماتا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝

(سورۂ کہف ۲۸)

اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں، اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، ان کے ساتھ صبر کرتے رہو، اور تمہاری نگاہیں ان میں سے (گذر کر اور طرف) نہ دوڑیں کہ تم آرائش زندگانی دنیا کے خواستگار ہو جاؤ، اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے، اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہا نہ ماننا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِينَ ۝

(سورہ انعام ۵۲)

اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں (اور) اس کی ذات کے طالب ہیں ان کو (اپنے پاس سے) مت نکالو ان کے حساب (اعمال) کی جوابدہی تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جوابدہی ان پر کچھ نہیں (پس ایسا نہ کرنا) اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے

باقی احادیث صحیحہ جو کثرت نوافل، کثرت ذکر، اور کثرت تلاوت کی فضیلت میں آئی ہیں، ان کا استقصا مشکل ہے، صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں اس کی مستقل کتابیں اور ابواب دیکھ لئے جائیں، کثرت نوافل کی فضیلت کے لئے وہ حدیث جو تقرب بالنوافل اور اس کے نتیجے کے بارے میں آئی ہے[1] اور کثرت ذکر کی فضیلت کے لئے مندرجہ ذیل حدیث کافی ہے۔

عن عبد الله بن بسر رضی الله عنہ أن رجلاً قال: یارسول الله إن شرائع الإسلام قد کثرت علیَّ فأخبرنی بشیٔ أتشبث بہ، قال: "لایزال لسانك رطباً من ذکر الله"[2]	عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول اسلام کے احکام تو مجھے بہت معلوم ہوتے ہیں (لیکن ان سب پر بیک وقت عمل کرنا میرے لئے مشکل ہے) لہذا کوئی ایسی ایک بات بتا دیجئے جسے میں حرز جاں بنا لوں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس کا اہتمام رکھنا کہ تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہے۔

رب واِلٰہ کی محض حاکمیت و اقتدار کے عقیدہ کا نفسیاتی اثر

اس طرز فکر اور طرز تحریر سے (جس کے کچھ نمونے اوپر پیش کئے گئے ہیں) اندیشہ پیدا ہوتا ہے، (اور اس کے آثار و علامات ظاہر ہو چکی ہیں) کہ جن لوگوں کے دینی معلومات اور

---

[1] ملاحظہ ہو حدیث "لایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی اکون سمعہ الذی یسمع بہ" الخ (صحیحین) [2] رواہ الترمذی

اسلام سے واقفیت کا تنہا ذریعہ اسلام کی یہی تفہیم وتشریح ہوگی، ان کا تعلق اللہ کی ذات سے ایک محدود، خشک، بے روح اور ضابطہ کا تعلق ہوگا، جو ان اندرونی کیفیات سے خالی ہوگا، جو مؤمن سے مطلوب ہیں، خصوصیت کے ساتھ جب بار بار انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد، اور ان کی تعلیمات کا ماحصل اسی دنیا اور اس کی محدود زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے، صالح انقلاب لانے، اور انسانی تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کو قرار دیا جائے، اور اس کو بار بار پوری بلند آہنگی کے ساتھ اس طرح بیان کیا جائے کہ محبت ورضائے الٰہی اور فلاح اخروی کے تصورات وتوقعات اس کے نیچے دب کر رہ جائیں تو یہ امر بالکل قدرتی ہے، اور اس کا یہ نتیجہ بالکل خلاف عقل وخلاف فطرت نہیں کہ فکر واہتمام، اور سعی وعمل کی پوری گاڑی ایمان بالغیب، شوق آخرت، طلب محبت ورضا کی اس پٹری سے ہٹ کر جس پر انبیاء علیہم السلام اس کو ڈالتے ہیں، طلب عزت وغلبہ اور شوق اقتدار اور بالاختصار مادیت کی پٹری پر پڑ جائے۔

حسب ذیل اقتباسات پر نظر ڈالی جائے اور رائے قائم کی جائے کہ فکر کے اس سانچے سے کس طرح کے دل ودماغ ڈھل کر نکلیں گے۔

۱۔ "اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایک ایسی جماعت بنانا ہے، جو انسانی تمدن کو خیر وفلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے"۔[1]

۲۔ "اسی تہذیب وتمدن کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام پے درپے بھیجے گئے تھے"۔[2]

۳۔ "پس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومت الٰہیہ

---

[1] "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" حصہ اول ص۵

[2] تجدید واحیاء دین ص۲۱ شائع کردہ مکتبۂ جماعت اسلامی، دار الاسلام، پٹھان کوٹ پنجاب۔

قائم کرکے اس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے"[۱]

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی، بعض کی ساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام، اور بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کردی، مگر حکومت الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی ان کا کام ختم ہوگیا جیسے حضرت مسیح علیہ السلام، اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہونچادیا، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم"[۲]

کیا اسلامی عبادات وارکان اربعہ محض وسائل وذرائع ہیں؟

اسی کے ساتھ اس کا اضافہ کیجئے کہ مصنف وداعی پر یہ مرکزی خیال اتنا مستولی ہوجاتا ہے کہ اس کو تمام اسلامی عبادات، اور اسلام کے ارکان اربعہ (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) سب اسی مقصد اصلی کے حصول کے وسائل وذرائع، اور اس کے لئے مشق وتمرین نظر آنے لگتے ہیں، اور وہ بکرّات ومرّات اس کو پوری وضاحت سے ظاہر کرتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہی غرض ہے جس کے لئے اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان کو عبادت کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہی عبادت ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس اصلی عبادت کے لئے آدمی کو تیار کرتی ہے، یہ اس کے لئے لازمی ٹریننگ کورس ہے"[۳]

---

[۱] ایضاً ص۲۲ [۲] ایضاً ص۲۲

[۳] اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر حصہ اول ص۱۳ شائع کردہ دارالاشاعت، نشأۃ ثانیہ، حیدرآباد۔

قرآن کا بیان اور اس کی ترتیب

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان عبادات معیّنہ و مشروعہ (نماز پنجگانہ) کی اصل حیثیت وسائل و ذرائع سے زیادہ نہیں، مقصود حقیقی نظم و اطاعت اور حکومت الٰہیہ کا قیام ہے، حالانکہ قرآن شریف اس کے برعکس جہاد و حکومت کو وسیلہ اور "اقامت صلوٰۃ" کو مقصود و نتیجہ بتاتا ہے، سورۂ حج کی حسب ذیل آیات پڑھئے، اور دیکھئے کہ قرآن مجید میں کس کو وسیلہ اور کس کو مقصود و نتیجہ کا درجہ دیا گیا ہے؟:-

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ	جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی
ظُلِمُوا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ	ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ
لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ	ان پر ظلم ہو رہا ہے، اور خدا (ان کی مدد کرے گا
دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا	وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ لوگ
رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ	ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ	(انھوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے
وَبِيَعٌ وَّصَلَوَاتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ	ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے، اور اگر خدا
فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا وَلَيَنْصُرَنَّ	لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو
اللّٰهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ	(راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے)
عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ	عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں
أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا	خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے، ویران
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ	ہو چکی ہوتیں، اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے،

عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ۔ (سورہ حج ۳۹-۴۱)

خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے، بے شک خدا توانا اور غالب ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور نیک کام کرنے کا حکم دیں، اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

اسوۂ رسول اور ذوق نبوی کی شہادت

"وسائل" سے قدرۃً ایک ضابطہ اور ضرورت کا تعلق ہوتا ہے، اور ان کو ایک عبوری مرحلہ سمجھنے کا ذہن پیدا ہونا ناگزیر ہے، انسان میں ان کے بارے میں ترقی کرنے، ان کے مراتب عالیہ تک پہونچنے کا ذوق، فکر اور ان سے لذت و سکون حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا، ایسی حالت میں ایک فہیم انسان ان احادیث کا مطلب اور ان کی قدر و قیمت سمجھنے سے قاصر رہتا ہے، جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ "وبجوفہ أزیز کأزیز المرجل من البکاء"[۱] (سجدہ میں سینۂ مبارک سے (فرط گریہ کی وجہ سے) ایسی آواز سنائی دیتی تھی، جیسی ہانڈی کے ابلنے کے وقت ہوتی ہے۔)

اسی طرح آپ کا فرمانا "جعلت قرۃ عینی فی الصلاۃ"[۲] (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) اسی طرح سے آپ کا حضرت بلال رضی اللہ تعالے عنہ

[۱] ابوداؤد، ترمذی [۲] نسائی

سے فرماتا "یا بلال أقم الصلاۃ أرحنا بہا"[۱] (بلالؓ نماز کھڑی کرو، اور ہمیں اس سے آرام پہونچاؤ)

اسی طرح آپ کا نماز کے ساتھ ایسا تعلق کہ جب ذرا پریشانی کی بات پیش آتی تو آپ نماز کی نیت باندھ لیتے "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا حزبہ أمر صلی"[۲] (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی کی بات پیش آتی نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے)

قرآن مجید پر ایک نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلق مع اللہ، عبودیت و بندگی، اور عبادات معیّنہ (ارکان اربعہ: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) بندے سے اس طرح مطلوب و مقصود ہیں کہ انھیں کے متعلق قیامت میں سوال ہوگا، اور ان کا ترک یا ان سے تغافل موجب وبال و نکال، ایک جگہ ان لوگوں سے سوال و جواب کے موقعہ پر جو جہنم کے عذاب کے مستحق ہوئے ارشاد ہے:۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۝ (سورہ مدثر ۴۲-۴۷)	کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے، وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے، اور اہل باطل کے ساتھ مل کر (حق سے) انکار کرتے تھے اور روز جزاء کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی۔

دوسری جگہ کفار کے تذکرے میں ارشاد ہے:۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ ۝ وَلَٰكِن كَذَّبَ	تو اس (ناعاقبت) اندیش نے نہ تو (کلام

---

[۱] ابوداؤد [۲] ایضاً

وَتَوَلّٰیۙ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰىؕ (سورہ قیامہ ۳۱-۳۳)

خدا کی) تصدیق کی نہ نماز پڑھی بلکہ جھٹلایا اور منہ پھیر لیا، پھر اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا چل دیا۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبادات وارکان دین، دین کے پورے نظام میں بنیادی و مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، جن پر محاسبہ و مؤاخذہ ہوگا، باقی چیزیں (حکومت الٰہیہ کا قیام اور انسانی تمدن کو خیر و فلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرنا) وسائل کی حیثیت رکھتی ہیں، اور دین میں ان کا درجہ دوسرا ہے۔

عبادات وارکان کو وسائل ماننے کا نفسیاتی اثر

وسائل سے بقدر ضرورت اشتغال ہوتا ہے، ان سے شغف اور ان میں انہماک پیدا نہیں ہوتا، اگر یہ عبادات (یہاں تک کہ فرائض پنجگانہ) محض وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں، تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قیام لیل اور طول صلوٰۃ کا یہ ذوق کہ قدم مبارک متورم ہو جاتے (حتی تورمت قدماہ)[۱] اور کثرت نوافل کی تحریض و ترغیب جس سے خاص طرح کا تقرب حاصل ہوتا ہے[۲]، ایک نماز کے بعد دوسرے نماز کے انتظار کی فضیلت جس کو "رباط" سے تعبیر کیا گیا ہے[۳]، قیامت میں جن خوش قسمتوں پر سایۂ الٰہی ہوگا،

---

۱ پوری حدیث اس طرح ہے "قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی تورمت قدماہ" (شیخین، ترمذی، نسائی بروایت مغیرہ بن شعبہ) (نبی صلے اللہ علیہ وسلم نماز میں اتنی دیر تک کھڑے ہوئے تھے کہ آپ کے دونوں قدم مبارک متورم ہو گئے)

۲ لایزال عبدی یتقرب إلیّ بالنوافل الخ (صحیحین) ۳ حدیث کا متن یہ ہے "ألا أدلكم على ما يمحوا الله به الخطايا، ويرفع به الدرجات، قالوا بلى يا رسول الله! قال: إسباغ الوضوء (باقی ص پر)

ان میں اس شخص کی شمولیت جس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ اس کا دل مسجد ہی میں اٹکا رہتا تھا، (قلبه معلق بالمساجد[۱]) پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کہ سجود کی کثرت کرو۔ علیك بكثرة السجود[۲]۔

اور سب سے بڑھ کر قرآن پاک میں مومنین خاص کے تعارف میں "وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا" اور "تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ" کے تعریفی الفاظ بتاتے ہیں کہ ان عبادات کی حیثیت محض نظم و اطاعت، اور قیام حکومت الٰہیہ کے وسائل و ذرائع کی نہیں بلکہ اعمال مقصودہ کی ہے، اگر وہ کسی چیز کے حصول کے وسائل و ذرائع کہے جا سکتے ہیں تو محض رضائے الٰہی اور قرب خداوندی کے۔

اس طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ عبادات سے قلبی تعلق، ان میں روح اور کیفیت پیدا کرنے، اپنے اندر خشوع و خضوع، اخبات و انابت، استحضار، دوام ذکر، اخلاص، ایمان و احتساب[۳] کی دائمی کیفیت پیدا کرنے کا جذبہ صادق ہی نہیں پیدا ہوتا، اس کی اہمیت و ضرورت کا

(باقی ص ۹۷ کا) علی المکارہ، وکثرة الخطا الی المساجد، وانتظار الصلاة بعد الصلاة، فذلکم الرباط، فذلکم الرباط" (مسلم بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) (ترجمہ۔ کیا میں تم کو ایسی چیز کا پتہ نہ بتا دوں جس کی وجہ سے اللہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے، اور درجے بلند کرتا ہے، لوگوں نے کہا کیوں نہیں، اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا، مشقتوں کے باوجود پوری طرح وضو کرنا، اور مسجدوں کی طرف زیادہ قدم اٹھانا، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا دراصل یہ مورچہ بندی ہے، دراصل یہ مورچہ بندی ہے) [۱] صحیحین [۲] پوری حدیث اس طرح ہے "علیك بكثرة السجود، فانك لا تسجد لله سجدة الا رفعك الله بها درجة، وحط عنك بها خطيئة" (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، مسند احمد بروایت ثوبان و ابو درداء رضی اللہ عنہما) تم سجدوں کی کثرت کرو، اس لئے کہ تم اللہ کے لئے جب بھی کوئی سجدہ کرو گے اللہ اس کی وجہ سے تمہیں ایک درجہ بلند کرے گا، اور تمہارا ایک گناہ معاف کر دے گا۔

[۳] اس کی تشریح پیش لفظ کے حاشیہ میں کی جا چکی ہے۔

بہ شدت احساس، اس میدان میں اپنی ترقی و تکمیل کی سچی فکر و طلب، اس کے بارے میں بلند ہمتی، اس میں امتیاز و اختصاص رکھنے والوں اور اس سلسلہ میں مدد و رہنمائی کرنے والوں کی مخلصانہ تلاش، اور خاص اس گوشہ میں (دوسرے علمی و ذہنی و عصری کمالات سے صرف نظر کر کے) استفادہ کی کوشش ختم ہو جاتی ہے۔

یہ تحتی براعظم (ہندوستان) پچھلی صدیوں میں ان اہل کمال اور اہل قلوب کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے، جو عبادات میں روح و کیفیت، قلب میں "اخبات و انابت" اور اعمال میں اخلاص و استحضار پیدا کرنے کے داعی و معلم تھے، اس نے اصلاح و تکمیل باطن کے ایسے محقق و ماہر پیدا کئے ہیں، جن سے عالم اسلام کے دور دراز گوشوں اور ان ملکوں تک نے فائدہ اٹھایا ہے، جو علوم اسلامیہ کا مرکز رہے ہیں، لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ عبادات کے محض وسائل ہونے کے تصور اور اصلاح و تزکیہ نفس کے فن کے عرفی نام "تصوف" کی وجہ سے (جو دور آخر کی پیداوار ہے) اور اس کے بعض مدعیوں کی "گندم نمائی و جو فروشی" اور ان کی علمی و عملی خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے[1] اس طرز فکر کے اصحاب کو اس کوچہ سے ایسی وحشت و نفرت پیدا ہو گئی، کہ وہ اس کا ذکر سننا بھی گوارہ نہیں کرتے، خود مولانا مودودی اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اپنا مخصوص انداز تحریر (جس کا عام جوہر متانت و شائستگی ہے) ترک کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور ان کے قلم سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں، جو ان کی عام تحریر سے میل نہیں کھاتے، مثلاً مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے جانشینوں کے تجدیدی کارناموں پر تبصرہ

---

[1] دنیا کا کوئی فن نیز... زندگی کی ضرورت پوری کرنے والی کوئی صنعت اور طبقہ اس فرق و اختلاف سے خالی نہیں کہ اس میں اصلی اور نقلی، ناقص اور کامل اور حاذق و عطائی دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں، لیکن اس کی وجہ سے اس پورے طبقہ سے صرف نظر نہیں کیا جاتا، اور نہ اس پر کلیۃً خط نسخ پھیر دیا جاتا ہے۔

کرتے ہوئے اس تصوف کے بارے میں لکھتے ہیں، جس کو ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ ترک نہیں کیا، بلکہ اس سے عمر بھر وابستہ رہے، اور اس کی دوسروں کو تعلیم دی:-

"پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اس وقت ممنوع ہو جاتی ہے، جب وہ مریض کے لئے نقصان دہ ہو، اسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے، کہ اسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکہ لگایا گیا ہے، اور اس کے قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو پھر وہی چنیا بیگم یاد آجاتی ہیں، جو صدیوں ان کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہیں"[۱]

تعطل و بطالت اور زندگی سے فرار کا مفروضہ

اصل بات یہ ہے کہ مولانا نے ایک بدیہی حقیقت کی طرح (جس میں ان کے نزدیک بحث و نظر ثانی کی کوئی گنجائش نہیں) اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ "تصوف" تعطل اور بطالت کا دوسرا نام، اور زندگی سے فرار، معرکۂ حق و باطل سے پسپائی بلکہ باطل طاقتوں کے سامنے نہ صرف سپر افگندگی بلکہ ان سے ساز باز کے مرادف ہے، اور یہ دونوں باتیں اس طرح لازم و ملزوم ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"کیا واقعی کہیں صوفیانہ لٹریچر میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اقامت دین اپنے وسیع اور جامع تصور کے ساتھ ان بزرگوں کے پیش نظر تھی، جن سے یہ صوفیانہ طریقے ماثور ہیں؟ کیا کہیں اس بات کا پتہ نشان ملتا ہے کہ اسی مقصد کے لئے کارکن تیار کرنے کی غرض سے انھوں نے

---

[۱] تجدید و احیاء دین صفحہ ۷۳-۷۴

ان طریقوں کو اختیار کیا تھا؟ کیا ان طریقوں سے تیار کئے ہوئے آدمیوں نے کبھی یہ کام کیا؟ اور کیا ہے، تو یہ طریقے اس کام میں مفید ثابت ہوئے ہیں؟[1]

تاریخ جہاد و عزیمت سے دو مثالیں

اس کے جواب میں ہم تاریخ کے وسیع ذخیرے میں جانے اور اس سے ایسے مجاہدین، قائدین انقلاب اور داعیوں کے نام پیش کرنے کے بجائے، جو سیف و تسبیح کے جامع محراب کے شب زندہ دار، اور میدان جہاد کے شہسوار، دار و رسن اور مصائب و محن کو دعوت دینے والے اور اپنے تیار کئے ہوئے لوگوں کے ساتھ باطل کی طاقتوں سے ٹکر لینے والے تھے، ہم مولانا ہی کی کتاب "تجدید و احیائے دین" سے حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی مثال پیش کرتے ہیں، جن کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ "ان دونوں بزرگوں (سید صاحبؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ) نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دیدی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی، اور یہ کہ "پیری مریدی کا سلسلہ سید صاحب کی تحریک میں چل رہا تھا" سید صاحب کے غیر معمولی اثرات و انقلاب آفرینی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

۱۔ "انھوں نے عامہ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا، اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہونچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

۲۔ انھوں نے اتنے وسیع پیمانہ پر جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سر تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہو سکتا تھا، جہاد کی تیاری کی، اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت

---

[1] رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۶۰۲

کا کمال ظاہر کر دیا، پھر غایت تدبر کے ساتھ آغاز کار کے لئے شمالی مغربی ہندوستان کو منتخب کیا جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لئے موزوں ترین خطہ ہو سکتا تھا، پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصولِ اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کئے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے اور اس طرح انھوں نے دنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں روح اسلامی کا مظاہرہ کر دیا، ان کی جنگ ملک و مال، یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض کے لئے نہ تھی، بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی، ان کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشار کے مطابق ہے، اس غرض کے لئے جب وہ لڑے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی، اور پھر اتمام حجت کر کے تلوار اٹھائی، اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے، کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا، جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے، نہ کہ مفسد کی حیثیت سے، ان کی فوج کے ساتھ نہ شراب تھی، نہ بینڈ بجتا تھا، نہ بیسواؤں کی پلٹن ہوتی تھی، نہ ان کی چھاؤنی بدکاروں کا اڈہ بنتی تھی، اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ ان کی فوج کسی علاقہ سے گذری ہو اور اس علاقہ کے لوگ اپنے مال اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹنے پر ماتم کناں ہوں، ان کے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے، خدا سے ڈرنے والے، آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے، اور ہر حال میں راستی پر قائم رہنے والے، خواہ اس پر قائم رہنے میں ان کو فائدہ پہونچے یا نقصان، انھوں نے کہیں شکست کھائی تو بزدل ثابت نہ ہوئے، اور کہیں فتح پائی تو جبار اور متکبر نہ پائے گئے۔

۴۔ ان کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقعہ ملا، اس میں انھوں نے ٹھیک اس طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے، وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل و انصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا، اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو، اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا، اور اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو میں انھوں نے اس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی صدیقؓ و فاروقؓ نے کی تھی![1][2]

کیا حضرات شہیدین کی جد و جہد "اقامت دین" کی کوشش نہیں تھی؟

یہاں پر بڑے ادب کے ساتھ پوچھا جا سکتا ہے کہ سید صاحبؒ اور ان کے رفیق و مسترشد مولانا اسماعیل شہیدؒ نے جن مقاصد کے لئے یہ جد و جہد کی، اخلاق و معاملات کی اصلاح، زندگیوں میں زبردست انقلاب پیدا کر دینے، جہاد کے لئے لوگوں کو تیار کرنے، پھر اس کو صحیح اسلامی اصولوں پر انجام دینے، اور پھر اس نظام حکومت قائم کرنے میں جو خالق و مالک الملک کے منشاء کے مطابق تھا، اور اس طرز کی حکومت قائم کرنے میں جس پر خلافت علیٰ منہج النبوۃ کی تعریف صادق آتی ہے، جو کامیابی حاصل کی، کیا وہ "اقامت دین" نہیں تھی؟[2] اور کیا یہ کارنامہ ان لوگوں کے ہاتھوں انجام نہیں پایا جو نہ صرف تصوف کے قائل و عامل بلکہ اس کے داعی و معلم بھی تھے۔

---

[1] تجدید و احیائے دین ص۱۰۱-۱۰۲ [2] اقتباس کی خط کشیدہ عبارتوں اور جملوں پر خاص طور پر نظر ڈالی جائے جو "اقامت دین" ہی کی تشریح و توضیح ہیں۔

نفسیاتی و منطقی طور پر بھی اس "کارِ عظیم" کے اہل وہی حضرات ہو سکتے ہیں، جو نفس کی بندگی سے آزاد ہو چکے ہوں، "حُبِّ دنیا، حُبِّ جاہ" اور "یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ" (ان (مشرکین) میں سے ہر ایک یہی خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ ہزار برس جیتا رہے) کے جاہلی مرض سے انھوں نے مکمل رہائی پائی ہو، اور ان کے رونگٹے رونگٹے سے یہ صدا آرہی ہو کہ "غداً ألاقی الأحِبّہ، محمداً وحِزْبَہ"[1] (کل کو دوستوں سے ملاقات ہوگی، یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں سے) اس موقعہ پر اپنی ایک پرانی تحریر کا ایک اقتباس نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، انھیں مردانِ خدا اور ان کے جذبۂ جہاد و شوقِ شہادت کا ذکر کرتے ہوئے راقم سطور نے لکھا تھا:۔

"حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات و ریاضات، تزکیۂ نفس، اور قربِ الٰہی سے عشقِ الٰہی اور جذب و شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے ؎

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اس لئے روحانی ترقی اور کمالِ باطنی کا آخری لازمی نتیجہ شوقِ شہادت ہے، اور مجاہدہ کی تکمیل جہاد ہے۔

نفسیاتی پہلو سے غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہپر ہیں، جن سے جہاد و جد و جہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوبات نفسانی، عادات، مالوفات، مادی مصالح و منافع، اغراض و خواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بچ سکتا ہے، جس میں

---

[1] یہ وہ الفاظ ہیں، جو حضرت بلالؓ کے دمِ واپسیں کے وقت زبان پر جاری تھے، اور بہت سے اولیاء اللہ اور عارفین سے اسی طرح کے الفاظ منقول ہیں۔

کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کے عشق نے پارہ کی "تقدیر سیمابی" اور بجلیوں کی بیتابی پیدا کر دی ہو۔

انسانی زندگی کا طویل ترین تجربہ ہے کہ محض معلومات و تحقیقات اور مجرد قوانین و ضوابط، اور صرف نظم و ضبط، سرفروشی و جانبازی بلکہ سہل تر ایثار و قربانی کی طاقت و آمادگی پیدا کرنے کے لئے بھی کافی نہیں ہے، اس لئے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقتور تعلق اور ایک ایسی روحانی لالچ اور غیر مادی فائدے کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلہ میں زندگی بارِ دوش معلوم ہونے لگے، کسی ایسے ہی موقعہ اور حال میں کہنے والے نے کہا تھا ؎

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
اس نوید جانفزا سے سر وبالِ دوش ہے[1]"

کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے!

اب اس کے مقابلہ میں "اقامت دین" کی صرف ایک ہی مثال پیش کر دی جائے، جو کسی ایسی شخصیت یا جماعت کے ہاتھوں انجام پائی ہو جو تصوف سے ناآشنا، بلکہ اس کی مخالف اور منکر ہو، عالم اسلام کی پچھلی تاریخ ہمارے اور مولانا اور سیکڑوں اہل علم اور اہل نظر کے سامنے ہے کہیں ایسی جدوجہد اور تحریک کی نشاندہی کی جائے جو تصوف کے ان "جراثیم" سے بالکل "پاک" اور جس کے علمبردار خالص ذہانت، اپنے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہوں، اور ہر طرح کی دینی و روحانی صحبت اور باطنی تربیت سے محفوظ رہے ہوں[2]۔

---

[1] مجموعۂ مضامین "تصوف کیا ہے؟" مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ [2] اس موقعہ پر بعض ایسے جزئی مصلحین کا نام لیا جاسکتا ہے جنھوں نے دعوت دین یا اصلاح عقائد کا قابل قدر و ناقابل انکار کام انجام دیا (باقی ص۱۰۶ پر)

اس کے برخلاف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ کم سے کم انیسویں صدی کے اوائل سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک جن لوگوں نے استعماری طاقتوں سے پنجہ آزمائی کی، میدانِ جہاد آراستہ کیا، اسلامی معاشرہ میں جرأت و حریت، ایثار و قربانی، بلند ہمتی و حوصلہ مندی اور سرفروشی و جانبازی کی روح پھونک دی، اور مغرب کی بڑی بڑی طاقتوں کے (اپنے مجاہدین و رفقاء کی قلیل تعداد اور حقیر وسائل کے ساتھ) چھکے چھڑا دیئے، اور سالہا سال اپنے ملکوں کو ان مغربی طاقتوں کا لقمۂ تر بننے سے بچایا، وہ سب کے سب کسی نہ کسی سلسلۂ تصوف سے وابستہ، علماء ربانی و مشائخ روحانی کے صحبت یافتہ، اور احسان و معرفت کے ذوق آشنا تھے۔

مثال کے طور پر الجزائر کے مشہور مجاہد امیر عبدالقادر، سوڈان میں برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حریف و رقیب محمد احمد (مہدی سوڈانی) طرابلس کے مجاہدِ اعظم سیدی احمد الشریف السنوسی، طاغستان کے مجاہدِ کبیر شیخ شامل نقشبندی، تحریک اخوان المسلمین (جو جدید دور کی سب سے بڑی اسلامی تحریک ہے) کے بانی شیخ حسن البنّاؒ[1]، اور ہندوستان کی حد تک برطانوی حکومت کے سب سے بڑے معتوب و مغضوب مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی، مولانا احمد اللہ و مولوی محمد جعفر تھانیسری اسیران انڈمن، پھر ۱۸۵۷ء کے جہاد کے علمبردار احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، شاملی کے شہید حضرت حافظ ضامنؒ،

(باقی صفحہ ۱۰۵ کا) لیکن اول تو ان کے بارے میں جہاد و احیائے خلافتِ اسلامی کی قسم کی جدوجہد کا ثبوت نہیں ملتا، دوسرے اگرچہ وہ اصطلاحی تصوف سے ناآشنا تھے، لیکن ان کو نسبت احسانی و تعلق مع اللہ کی کیفیت حاصل تھی جو تزکیۂ نفس کا اصل مقصود ہے۔

[1] امیر عبدالقادر الجزائری، سیدی احمد الشریف (شیخ سنوسی) شیخ شامل نقشبندی داغستانی اور شیخ حسن البنا شہید کے مجاہدانہ کارنامہ کی تفصیلات اور ان کی شخصیت و حالات کے تعارف کے لئے مصنف کی کتاب "تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک" کا باب "اہل تصوف اور دینی جدوجہد" ملاحظہ ہو۔

اور اس تحریک کے قائد و مجاہد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کے مسترشدین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، پھر تحریک خلافت کے اصل روح رواں، اور برطانوی اقتدار کے سب سے بڑے حریف شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، اور صوبہ سرحد میں حاجی صاحب ترنگزئی، اور مولانا سیف الرحمٰن ٹونکی کا نام لیا جا سکتا ہے[1]، کیا یہ سب تعطل و بطالت کے مریض، حالات سے شکست خوردگی اور میدان جدوجہد سے فرار کا نمونہ، اور باطل قوتوں سے سمجھوتہ کرنے اور ان کے لئے، "دنیائے دنی" کو چھوڑ کر "خلوت گاہ حق" میں چلے جانے، اور مصلّی اور سجادہ پر زندگی گذار دینے والے تھے؟

تاریخ کا بے لاگ فیصلہ

حقیقتاً تاریخ کا موضوع ایسا واقعاتی، حقیقت پسند، اور ذکی الحس ہے کہ وہاں کوئی بات رواروی میں نہیں کہی جا سکتی، اس کے لئے تاریخی شہادتوں، حوالوں اور اعداد و شمار کی ضرورت ہوتی ہے، اور تاریخ کسی بڑے سے بڑے اہل قلم، داعی دین، یا صاحبِ فکر کے احترام میں اپنا ناقدانہ فیصلہ صادر کرنے سے باز نہیں رہتی۔

فریضۂ اقامت دین، شریعت و تاریخ کی روشنی میں

اس طاقت و اقتدار کے حصول کے لئے جدوجہد کے ضروری ہونے کے بارے میں

---

[1] اس اجمال کی تفصیل اور مدلل ثبوت کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مفصل مضمون "اہل تصوف اور دینی جدوجہد" مشمولہ کتاب "تصوف کیا ہے؟" مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔

علمائے اسلام میں (ہمارے علم میں) کبھی اختلاف نہیں رہا ہے، جس سے خدا کی حاکمیت انسانوں پر عملاً نافذ، اور اس کے احکام (قوانین و تعزیرات کی شکل میں) معاشرہ میں جاری کئے جا سکیں، کوئی ایسی متوازی قوت واقتدار اور نظام، اطاعت و حکومت اس کے مقابل نہ پایا جاتا ہو، جو لوگوں کے لئے کشمکش اور فتنے کا باعث ہو، اور جس کی طرف اس آیت قرآنی میں اشارہ ہے:۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ	اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ
وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ	فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے، اور
(انفال۔ ۳۹)	دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

نیز ایسی قوت اور حیثیت کا حصول بھی ضروری ہے کہ جس میں جماعت مسلمین کو محض دعوت و ترغیب ہی نہیں، بلکہ امر و نہی (حکم و ممانعت) کی حیثیت و صلاحیت حاصل ہو، اور وہ معروفات کو حکماً جاری کرنے، اور منکرات کو بزور روکنے کی استطاعت رکھتی ہو:۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ	پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام
الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ	کرنے کو کہتے ہو، اور برے کاموں سے منع
(سورہ آل عمران ۱۱۰)	کرتے ہو، اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔
وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ	اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے
وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ	جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے، اور اچھے کام

لہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے (لڑو جب تک فساد رہے) یعنی کافروں کو زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں اور سارا دین اللہ ہی کا ہو جائے۔

عَنِ الْمُنْكَرِ ﴿سورہ آل عمران ۱۰۴﴾ کرنے کا حکم دے، اور برے کاموں سے منع کرے

ایسی قوت و اقتدار کا حصول اور اس کے لئے جدوجہد آیات قرآنی اور نصوص قطعیہ سے مطلوب ہے، اور اس میں تساہل و غفلت کسی طرح جائز نہیں، اس فریضہ کو چھوڑ دینے کے نتائج کے ذکر سے جو اسلام کی غربت، مسلمانوں کی مظلومیت، حدود و احکام الہٰی کے تعطل، اور اس کی وجہ سے زندگی کی بے نظمی اور انتشار، اور نصرت خداوندی، اور دینی و دنیوی برکتوں سے محرومی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، قرآن و حدیث کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، اور اسی بنا پر خلافت و امارت کے نظام کے قیام کو اتنی اہمیت دی گئی کہ جو زندگی اس کے بغیر ہو وہ جاہلی زندگی، اور اس حالت میں موت کو "مِيتَةً جَاهِلِيَّةً" قرار دیا گیا[1]، اسی بنا پر صحابہ کرامؓ نے وفات نبوی کے بعد اس کو اولیت دی اور ہر کام پر اس کو مقدم رکھا، اسی کو اپنے صحیح نہج پر لانے کے لئے حضرت علی مرتضیٰؓ نے طویل جدوجہد جاری رکھی اور حضرت حسینؓ نے قربانی دی، اور ہر دور میں فقہائے امت اور اہل عزیمت اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاتے رہے، اور آج اسی سے غفلت برتنے اور اس نعمت سے محروم ہو جانے کی سزا میں پورا عالم اسلام ذلیل و خوار اور بے وزن و اعتبار ہے۔

لیکن یہ سب ایک اہم اور لابدی وسیلہ کے طور پر ہوگا، اس کو کل دین، اور مقصد اولین کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی، راسخ العلم علمائے اسلام میں جن لوگوں نے کتاب و سنت کی پوری پوری ترجمانی کی ہے، اور جن کا فہم دین تمام تر کتاب و سنت کے وسیع و عمیق مطالعہ، سیرت نبویؐ، احوال صحابہ سے گہری واقفیت پر مبنی تھا، اور جن کا علمی مزاج، فکری سانچہ

---

[1] ان احادیث و آثار، اور اس ادارہ (خلافت و امارت) کی اہمیت کے دلائل کو تفصیل سے معلوم کرنے کے لئے راقم سطور کا وہ مقدمہ دیکھنا چاہئے جو اس نے "تاریخ امارت شرعیہ" شائع کردہ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے لئے لکھا تھا

اور دعوت کا اسلوب، علوم نبوت ہی کے دبستان کا ساختہ پرداختہ تھا، اور ان پر کسی خارجی تعلیم و تربیت کا اثر نہیں پڑا تھا، نہ وہ محض کسی عصری ضلالت یا کسی گمراہ و غلط تحریک و دعوت کا ردعمل تھا[1]، وہ جب اس مسئلہ پر کلام کرتے ہیں، یا اس کی اہمیت و ضرورت ثابت کرنا چاہتے ہیں، یا اس کے موجود نہ ہونے اور مسلمانوں کے اس سے دست کش ہو جانے پر خون کے آنسو بہاتے ہیں، تو ان کی زبان، ان کا پیرایۂ بیان، اور اس دعوت میں ان کے جذبات و محرکات بالکل الگ ہوتے ہیں، اور مقصد و وسیلہ کے درمیان جو واضح لیکن نازک نسبت ہے، وہ ان کی ہر تحریر سے جھلکتی ہے، اور صاف معلوم ہوتا ہے، کہ قوت و اقتدار کے حصول کی جدوجہد، قیام خلافت و امارت کی سعی و دعوت محض رضائے الٰہی، اتباع نبوی، دین حق کے غلبہ، ارکان اسلام کے قیام، علوم دینیہ کے احیاء، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی خاطر ہے۔

---

[1] راقم سطور نے اپنی کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" میں انبیاء اور دوسرے رہنماؤں کا بنیادی فرق بتاتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس کا نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:-

"اس ردعمل کے اثرات (جو بعض اوقات خوردبین کے بغیر نہیں دیکھے جا سکتے) بہت سے ان اسلام پسند مصنفین اور داعیوں کی تحریروں میں نظر آتے ہیں، جن کو موجودہ مادی فلسفوں، مغربی سیاست و اقتدار کی کامیابی اور اپنے ملک کے مسلمانوں کی غیر منظم زندگی یا غلامی نے اسلام کے مطالعہ، صورت حال کا مقابلہ کرنے، اور ان فلسفوں اور نظامہائے حیات کے متوازی اسلامی فلسفہ اور نظام حیات کے پیش کرنے پر آمادہ کیا، ان کی تحریریں، تعبیریں اور ان کے طرز فکر میں اس "ردعمل" کے عکس اور سایے اس شخص کو آسانی کے ساتھ نظر آ سکتے ہیں، جس کو ماحول کے اثرات اور عمل وردعمل کے سلسلے سے آزاد ہو کر کتاب و سنت کے براہ راست مطالعہ کا موقع ملا ہے، پھر وہ ان جدید فلسفوں اور نظامہائے حیات کی آہنی گرفت اور جسم و جان میں پیوست ہو جانے والے اثرات سے بھی واقف ہے" (ص۵۰)

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی بے نظیر کتاب "إزالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں خلافت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:۔

هي الرئاسة العامة في التصدي لإقامة الدين بإحياء العلوم الدينية وإقامة أركان الإسلام، والقيام بالجهاد وما يتعلق به من ترتيب الجيوش، والفرض للمقاتلة، وإعطائهم من الفيء، والقيام بالقضاء وإقامة الحدود، ورفع المظالم، والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، نيابة عن النبي صلى الله عليه وسلم[1]	خلافت عبارت ہے اقامت دین کے لئے اقتدار اعلیٰ سے، اس طرح کہ دینی علوم کو زندہ کیا جائے، ارکانِ اسلام کو قائم کیا جائے، جہاد اور اس سے متعلق امور (یعنی فوجوں کی تنظیم اور مجاہدین کی بھرتی، اور ان پر مال غنیمت کی تقسیم) کے انتظامات کئے جائیں، نظام قضاء، اور حدود جاری کئے جائیں، مظالم کا قلع قمع کیا جائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قیام عمل میں آئے، اور یہ سب کچھ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی نیابت کے طور پر انجام دیا جائے۔

پھر اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"خلافت کے ان سب مقاصد اور شعبوں کو اگر ایک جملہ میں بیان کرنا چاہیں، جو ان جزئیات کے لئے کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور ان انواع و اجناس کی جنس اعلیٰ ہے، تو وہ "اقامت دین" ہے۔"[2]

---

[1] ازالۃ الخفاء ص۲ مطبوعہ سہیل اکیڈمی، لاہور۔ [2] ایضاً

پھر وہ صراحت سے لکھتے ہیں کہ :۔

"اس کا انتظام قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے ذمہ واجب بالکفایہ ہے"[1]

پھر وہ اس کے شرعی دلائل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ :۔

"اللہ تعالٰی نے جہاد و قضاء، احیاء علوم دین، اقامت ارکان اسلام، کفار کے تسلط سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کو فرض بالکفایہ قرار دیا ہے، اور یہ سب "امام" کے تقرر و انتخاب کے بغیر صورت پذیر نہیں ہو سکتا، اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ مقدمۂ واجب، واجب ہوتا ہے، (یعنی اگر کوئی واجب کسی عمل کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتا تو وہ عمل بھی واجب ہوگا)"[2]

یہاں پر یہ حقیقت بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ لفظ "اقامتِ دین" کو محض حکومت الٰہیہ کے قیام کی کوشش کا مرادف قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ اس سے زیادہ جامع اور وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو عام طور پر جماعت کے لٹریچر میں استعمال ہوتا ہے، اقامتِ دین میں وہ سب شعبے آتے ہیں، جن کو شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی عربی عبارت میں بیان کیا ہے، "أَقِيمُوا الدِّينَ" کے الفاظ قرآن مجید میں ایک ہی جگہ سورہ شوریٰ آیت ۱۳ میں آئے ہیں، فرمایا گیا :۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ	مقرر کیا تمہارے لئے دین سے وہ کہ وصیت
نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا	کی اس کی نوح کو اور وہ کہ وحی کی ہم نے
وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ	تیری طرف اور جو بتایا ہم نے ابراہیم کو
أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ	اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ سیدھا رکھو

---

[1] ایضاً ص ۳   [2] ایضاً

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ إِلَيْهِ ۚ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ○ (شوریٰ - ۱۳)	دین اور نہ جدا جدا ہو اس میں گراں ہے مشرکوں پر.. کہ بلاتے ہو تم ان کو اس کی طرف اللہ مقبول بنا لیتا ہے اپنا جسے چاہے اور راہ دکھاتا ہے... اپنی جو رجوع کرے۔

آیت کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ اس سے پورا دین اور اس کی تعلیمات (عقائد و عبادات و معاملات) مراد ہیں، صرف خلافت و حکومت اور حصولِ قوت و اقتدار نہیں، علامہ آلوسی اپنی مشہور تفسیر "روح المعانی" میں "أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

أي دين الاسلام الذي هو توحيد الله وطاعته والايمان بكتبه و رسله وبيوم الجزاء، وسائر ما يكون العبد به مومنا، والمراد باقامته تعديل أركانه، وحفظه من أن يقع فيه زيغ والمواظبة عليه۔[1]	یہاں دین سے مراد دین اسلام ہے جو کہ عبارت ہے اللہ تعالیٰ کی توحید و اطاعت اس کی کتابوں اور رسولوں اور یوم الجزاء پر ایمان لانے اور تمام عقائد و اعمال سے جو ایمان کے لئے ضروری ہیں جن سے بندہ مومن ہوتا ہے، اور دین کی اقامت سے مراد اس کے ارکان کی تعدیل اور ہر طرح کی کجی اور گمراہی سے اس کو بچانا اور دین پر مداومت کرنا ہے۔

---

[1] روح المعانی جلد ۷ ص ۵۱۳

بعد میں ان کے سرمایۂ فخر و سرآمد روزگار پوتے مولانا اسماعیل شہیدؒ نے اس موضوع پر پوری کتاب "منصب امامت" کے نام سے لکھی، جو اپنے موضوع پر بعض حیثیتوں سے پورے اسلامی کتب خانہ میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے، اور اپنے زور بیان، قوت استدلال اور لطیف نکات کی کثرت میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

ہندوستان میں تیرہویں صدی کے نصف اول میں حضرت سید احمد شہیدؒ نے "اقامت دین" کے اس خصوصی شعبہ کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، اور اسلام کے لئے اس طاقت و اقتدار کے حصول، اس فضا اور ماحول کے قیام، اور ان وسائل و اسباب کی فراہمی کی، ایسی منظم و پرعزم داعیانہ و قائدانہ کوشش کی، اور اس کی دعوت ایسی آب و تاب، اور اس جوش و ولولہ کے ساتھ دی کہ اس کی نظیر نہ ماضی قریب میں ملتی ہے، اور نہ ان کے بعد اس پیمانہ پر کم سے کم اس برصغیر میں نظر آتی ہے، ان کے نامور سوانح نگار مولانا غلام رسول مہر نے "سید احمد شہیدؒ" میں صحیح کہا ہے:۔

"تاریخ ہند و پاک میں جس عہد کو مسلمانوں کا دور زوال کہا جاتا ہے، یہ اسی کا ایک باب ہے، لیکن کیا کوئی حق پسند اور حق شناس انسان اس اعتراف میں تامل کرے گا کہ مسلمانوں کے عہد عروج و اقبال کا بھی کوئی حصہ اصولاً اس سے زیادہ شاندار یا زیادہ قابل فخر نہیں ہو سکتا ــــــ حکم و فیصلہ کا انحصار نتائج پر نہیں بلکہ عزم جہاد، ہمتِ عمل، اور راہِ حق میں کمال استقامت پر ہوتا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کمال عزیمت کمال ہمت و استقامت کی ایسی مثالیں ہمارے عہد عروج کی داستانوں میں مل سکتی ہیں جن میں مقصود و نصب العین دین اور صرف دین رہا ہو۔"[1]

---

[1] "سید احمد شہیدؒ" مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

یہاں سید صاحب کے ان مکتوبات کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو انھوں نے مسلمان والیان حکومت اور برصغیر کے علما و رؤسا کو لکھے، ان سے ان کا جذبۂ اصلی مقصود حقیقی اور ذہن وفکر معلوم ہوگا، جو اس پوری دعوت و جدوجہد میں کام کر رہا تھا، اور یہ کہ ان کا مقصود تعمیل حکم، رضا و محبت الٰہی، اور اس عمل کا محرک اسلام کے زوال، اور مسلمانوں کی بےبسی کے سوا کچھ نہ تھا، اور اعلاء کلمۃ اللہ، احیاء سنت، اور بلاد اسلامیہ کے استخلاص کے سوا ان کا کوئی مطمح نظر نہیں، ان کو ان کے اس یقین و تجربہ نے اس اقدام پر آمادہ کیا کہ دین کا قیام سلطنت سے ہے، اور احکام شرعی کا نفاذ قوت و اقتدار کے بغیر نہیں ہو سکتا، وہ محض حکم کے بندے اور رضائے الٰہی کے طالب ہیں، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، علما و رؤسائے سرحد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

فقیر ہمیں مواعید الٰہیہ[1] اعتماد نمودہ و	فقیر نے اللہ کے وعدوں پر اعتماد کیا،
امتثال احکام رافبلۂ ہمت خود ساختہ	اور حکم حاکم (خداوند عالم) کی تعمیل
وجمیع ماسوی اللہ را پس پشت انداختہ	کو اپنا مرکز توجہ بنایا ماسوی اللہ کو
واز چپ و راست چشم ہمت بستہ و راہ	پس پشت ڈال دیا، گردوپیش سے
راست ورضائے مولائے خود پیش رو نہادہ	آنکھیں بند کر لی ہیں، اور رضائے مولیٰ
بکمال اطمینان و فرحت و غایت بشاشت	کی راہ راست کو سامنے رکھ کر کمال اطمینان
ومسرت دریں راہ تگاپو می نماید[2]	وفرحت و بشاشت و مسرت کے
	ساتھ اس راستہ پر چلا جا رہا ہے۔

---

[1] خدا کی نصرت اور رضا و خوشنودی کے وعدے جو اس کوشش پر قرآن و حدیث میں بیان کئے گئے ہیں۔

[2] سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول ص ۳۸۶

آگے اسی مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

چوں ما مردم کہ از بندگان پروردگار	ہم لوگ خدا کے بندے اور رسولؐ کی
امتیان رسول مختار دعوائے اسلام	امت ہیں، بلا شبہ اسلام کا دعویٰ
می داریم، وجان خود را در محمدیاں می	رکھتے ہیں، اور اپنے کو پیروان رسولؐ
شماریم، چوں کلام اللہ را بایں معنی ناطق	میں شمار کرتے ہیں، جب ہم نے اس بات
دانستیم، ورسول اللہ را صادق،	(جہاد) پر کلام الٰہی کو ناطق مان لیا
لامحالہ محض للہ فی اللہ امتثالاً لامر اللہ	ہے، اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
کمر بستیم واتباعاً لرسول اللہ براسپ	کو سچا سمجھ لیا ہے، لامحالہ ہم نے اللہ
سفر نشستیم[1]	اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لئے
	کمر ہمت باندھی ہے، اور اسوۂ رسول
	صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں سفر
	کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

ایک خط میں جو شاہ سلیمان والی چترال کے نام ہے اپنا اصل جذبہ ومحرک بیان کرتے ہوئے بہت صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ وہ طالب علو واقتدار نہیں، ان کا مقصد محض احکام الٰہی کا اجراء، اور سنن نبوی کا احیاء ہے، اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ حکومت و عدالت کے باب میں شریعت حقہ اور سنت مطہرہ کی پابندی کی جائے، اور کچھ نہیں، فرماتے ہیں:۔

ایں فقیر بتحصیل مال ومنال، وتصرف	اس فقیر کو مال ودولت اور حصول

---

[1] ایضاً ص۳۸۷

بلاد و امصار غرضے ندارد، ہر کہ از	سلطنت و حکومت سے کچھ غرض نہیں
اخوان مومنین استخلاص بلاد از	دینی بھائیوں میں سے جو شخص بھی کفار
دست کفار و مشرکین نمودہ در اجرائے	کے ہاتھوں سے ملک کو آزاد کرے
احکام رب العالمین و افشائے	رب العالمین کے احکام کو رواج
سنت سید المرسلین کوشید، و قوانین	دینے اور سید المرسلین صلے اللہ علیہ
شریعت در ریاست و عدالت	وسلم کی سنت کو پھیلانے کی کوشش
مرعی داشت، مقصود فقیر حاصل	کرے گا اور ریاست و عدالت میں
گشت، و نیز سعی من بہدف نشست [1]	قوانین شریعت کی رعایت و پابندی
	کرے گا فقیر کا مقصود حاصل ہو جائے گا
	اور میری کوشش کامیاب ہو جائے گی۔

پھر اس پر زور دیتے ہوئے ان کا جذبۂ ایمانی، اور جوش اخلاص اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ جاتا ہے، سردار سلطان محمد خاں، و سردار سید محمد خاں والیان پشاور کے نام خط لکھتے ہوئے ان کے قلم سے یہ پرزور فقرے نکلتے ہیں:۔

تاج فریدوں و تخت اسکندر بجوے	تاج فریدوں و تخت سکندری کی
نمی شمارم، و مملکت کسریٰ و قیصر بخیال	قیمت میرے نزدیک ایک جو کے
نمی آرم، آرے ایں قدر آرزو دارم کہ در	برابر بھی نہیں، کسریٰ و قیصر کی سلطنت
اکثر افراد بنی آدم بلکہ جمیع اقطار عالم	میں خاطر میں بھی نہیں لاتا، ہاں اس قدر
احکام حضرت رب العالمین کہ مسمیٰ	آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" ص ۳۹۱

بشرع متین است، بلامنازعت احدے نافذ گردد، خواہ از دست من، خواہ از دست کسے دیگر۔[۱]	بلکہ تمام ممالک عالم میں رب العالمین کے احکام، جن کا نام شرع متین ہے، کسی کی مخالفت کے بغیر جاری ہو جائیں، خواہ میرے ہاتھ سے، خواہ کسی دوسرے کے ہاتھ سے۔

ان کے مکاتیب، اور ان کے اصلی خیالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے جدوجہد کا محرک اصلی، اور اس معاملہ میں ان کے لئے فیصلہ کن چیز ان کا یہ فہم دین ہے کہ حکومت و قوت موجود نہ ہو تو شریعت اسلامیہ و قانون خداوندی کا ایک اچھا خاصا حصہ ناقابل عمل اور تعطل کے نذر ہو کر رہ جاتا ہے، اور مسلمان بے دست و پا، بلکہ دست و پا بستہ ہو کر رہ جاتے ہیں، اور اپنی آنکھوں سے اسلام کے شعائر کو مٹتے ہوئے، اور معابد و مساجد کی تخریب ہوتے ہوئے، دیکھتے ہیں، اور کچھ نہیں کر سکتے، سرداران موصوف ہی کے نام خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

احکام دینیہ کہ تعلق بحکومت دارند بوقت نبودن مملکت صاف از دست می روند، و خرابی امور مسلمین، و ذلت و نکبت ایشاں از دست کفار متمرداں، و اہانت شعائر مقدس و تخریب معاہد و مساجد	اور وہ دین احکام جن کا تعلق سلطنت سے ہے، سلطنت کے نہ ہونے سے صاف ہاتھ سے نکل جاتے ہیں، اور مسلمانوں کے کاموں کی خرابی اور سرکش کفار کے ہاتھوں ان کی ذلت و نکبت اور شریعت مقدسہ کے

[۱] "سیرت سید احمد شہید" ص ۳۹۲

مسلمین کہ می شود، پر ہویدا است[۱] — شعائر کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی مساجد و معابد کی تخریب جو ہوتی ہے، وہ بخوبی ظاہر ہے۔

اقامت دین، حکمت دین کے ساتھ

لیکن "اقامت دین کا یہ شعبہ (اسلام کو غالب اور قوت حاکمہ کا مالک بنانے کی کوشش) بھی کوئی ایسا بے لچک آہنی سانچہ نہیں ہے، جو ٹوٹ تو سکتا ہے لیکن پھیل نہیں سکتا، جن لوگوں کے اخلاص، رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین پر ہم کو اعتماد ہے، اور اس کے پورے آثار و قرائن، اس کی واضح شہادتیں تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں، اور یہ بھی اندازہ ہوگیا ہے، کہ وہ اہل رخصت میں سے نہیں بلکہ اہل عزیمت میں سے تھے، ان کا یہ حق ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں اس مقصد کے لئے جس طریق کار اور جس طرح کی سعی یا جہد کو مناسب و مفید سمجھا اس کو اختیار کیا، اور ان حالات میں جن میں وہ زندگی گذار رہے تھے، جو کچھ وہ کر سکتے تھے، اس سے دریغ نہیں کیا اس لئے کہ مقصود نتیجہ ہے نہ کہ وسیلہ، تعمیر ہے، نہ کہ تخریب، ایجاب و اثبات ہے، نہ کہ سلب و نفی کوئی ذی عقل انسان یہ نہیں کہے گا کہ ان کوشش کرنے والوں کے لئے ہر حال میں ضروری تھا، کہ وہ بنی بنائی عمارت کو (جس میں کچھ خرابیاں تھیں، یا جس کا غلط استعمال ہو رہا تھا) کلی طور پر منہدم کرنے میں اپنی ساری توانائی، اور فرصت عمر صرف کر دیں، اور اس کو کھنڈر بنا کر دم لیں، پھر اس کی نئی تعمیر کی نوبت آئے یا نہ آئے، مستحکم اور وسیع مسلمان

---

[۱] ایضاً ص ۳۹۱

حکومتوں کی موجودگی میں جن کا سربراہ بہت سی اہلیتوں کا مالک بھی ہوتا تھا، اور اس کو بہت سی سہولتیں بھی حاصل تھیں، اگر انھوں نے کلی مخالفت کے بجائے تفہیم و اصلاح اور مشورہ و صلاح سے کام لیا، اور "ازالہ" کے بجائے "امالہ" کے حکیمانہ اصول پر عمل کیا، تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے اقامت دین کے اس شعبہ کو یکسر فراموش کردیا اور "تعاون علی الاثم والعدوان" کے مرتکب ہوئے یا اگر انھوں نے معاشرہ کی اصلاح، جاہلیت سے اسلام کی طرف اس کے رخ کو پھیرنے، نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی، اور معصیت پسندی کے بجائے طاعت پسندی کی طرف اس کو مائل کرنے پر اپنی پوری روحانی، علمی، تقریری اور تحریری قوت لگادی کہ صحیح اسلامی و ایمانی معاشرہ ہی وہ مضبوط اور مسطح زمین ہے، جو ہر وزنی اور بلند عمارت کا بوجھ اٹھا سکتی ہے، اور صالح قیادت کو قبول اور برداشت کرسکتی ہے، اس کے ساتھ انھوں نے مرکز قیادت اور ایوان حکومت سے بھی رابطہ رکھا، حکومت کو شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے، نظم و نسق چلانے اور مالیات کے حصول و صرف کے لئے مفصل قانون مرتب کر کے دیا، حاکم وقت پر اپنی اخلاقی و روحانی بلندی اور اپنے خلوص و بے غرضی کا سکہ بٹھا کر اس کو بارہا اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہونچانے والے اقدام سے بچایا، اس کے ذریعہ قانون شریعت اور حدود الٰہیہ کا اجراء بھی کرایا، دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف صف آرا کیا، جہاد اور مملکت اسلامی کی توسیع کا باعث ہوئے، ایسے خدا ترس، امانت شعار، اور اہل و کارگذار کارکن اس کو مہیا کئے، جن کی انھوں نے سالہا سال اپنے پاس رکھ کر تربیت کی تھی، اور بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ انھیں کے اثر سے تخت سلطنت اور مملکت کا نظم و نسق بے دین وارث ملک و تاج سے دیندار جانشین کی طرف، مخالف اسلام سے محافظ اسلام کی طرف، اور ماحی دین سے

حامی دین کی طرف منتقل ہوا، ہمیں ان سب کو سعی اقامت دین کا علمبردار، اور تجدید و احیاء دین کی مبارک فوج کا ایک وفادار سپاہی تسلیم کرنا پڑے گا، اور اس وجہ سے ہم ان کو اس فہرست سے خارج اور اس فریضہ سے غافل نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک معیاری حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں ناکام رہے۔

خود مولانا مودودی (پوری قوت سے) اس دینی حکمت، حالات میں فرق کرنے اور ان میں مناسب و امکانی کوشش کرنے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، اور اس کو حکمت عملی سے تعبیر کرتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"حکمت عملی ہی یہ طے کرتی ہے کہ منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے راستہ کی کن چیزوں کو آگے پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیئے، کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیئے، اور اپنے اصولوں میں سے کن میں لچک ہونا، اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیئے"۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"مختصراً اس (حکمت عملی) سے مراد یہ ہے کہ دین کی اقامت اور احکام شرعیہ کی تنفیذ میں ان حالات پر نگاہ رکھی جائے جن کے اندر ہم کام کر رہے ہوں، اور فتویٰ اور طرز عمل میں ایسا تغیر و تبدل کیا جائے، جس سے مقاصد شرعیہ ٹھیک ٹھیک حاصل ہو سکیں، نہ کہ نامناسب حالات پر احکام و اصولوں کے انطباق سے وہ

---

[1] تفہیمات حصہ سوم ص۹۱-۹۲، عنوان: "اسلام میں مصلحت و ضرورت کا لحاظ اور اس کے اصول و قواعد" شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی۔

الٹے فوت کر ڈالے جائیں"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"جس کو بھی اقامت دین کے لئے عملاً کام کرنا ہو، خواہ وہ کوئی ایک شخص ہو، یا کوئی جماعت یا کوئی ریاست، اسے لازماً حالات پر نگاہ رکھ کر حکمت کے ساتھ ہی کام کرنا ہوگا، اور اس راہ میں کام کرتے ہوئے ضرورت پیش آنے پر اس کو صرف جائز تدابیر ہی میں ردّوبدل نہیں کرنا ہوگا، بلکہ بعض اوقات اس نوعیت کی رخصتوں سے بھی فائدہ اٹھانا پڑے گا، جو شریعت نے دی ہیں، جن سے استفادہ کرنے میں انبیاء اور صحابۂ کرامؓ نے بھی تنزہ نہیں برتا ہے"[2]

اگر اس قاعدہ کو مان لیا جائے، اور ہمیں ان شخصیتوں کے اخلاص، تفقہ فی الدین اور شان عزیمت پر بھی پورا وثوق ہو جس کی شہادت ان کی پوری زندگی دیتی ہے، تو ہمیں مستند تاریخ کی شہادتوں کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسائل کے استنباط کرنے اور امت کی رہنمائی کرنے والے ائمۂ مجتہدین، ذخیرۂ حدیث کی تحقیق و تدوین کرنے والے محدثین عظام، خراج و جزیہ و محاصل کا مرتب نظام پیش کرنے والے مقننین اسلام، اسلامی معاشرے کو مادیت و غفلت، دولت کی بہتات، فتوحات کی وسعت و کثرت کے نتیجے میں آنے والی فارغ البالی اور غفلت کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہ جانے سے روکنے والے اور نفس و اقتدار پرستی، قوت و دولت کے سامنے سر جھکانے اور عہدوں اور منصبوں کے پیچھے دیوانہ وار پھرنے اور اس پر اپنے دین و ایمان اور اصول و ضمیر کو قربان کر دینے کی وبائے عام سے حفاظت کرنے والے،

---

[1] ایضاً ص۱۸۳ [2] ایضاً ص۱۹۰

ایک آمادۂ زوال اور برسر انحطاط معاشرے میں آدم گری و مردم سازی اور سیرت و کردار کی تعمیر کا کام کرنے والے اور پھر ان تربیت یافتہ انسانوں کو خطرناک سرحدوں اور فیصلہ کن محاذوں پر نصب کرنے والے مصلحین امت، پوری پوری غیر مسلم اور بعض اوقات اسلام کی دشمن اور مسلمانوں کی فاتح قوموں، شاہی خاندانوں اور باا ثر اشخاص کو نہ صرف اسلام کا حلقہ بگوش بلکہ اسلام کا محافظ اور خادم بنا دینے کا خاموش کام کرنے والے اہل قلوب، بادشاہ وقت اور حاکم اسلام کو اپنی اخلاقی و روحانی بلندی اور اپنے خلوص و بے غرضی سے متاثر کرکے اس کو عدالت اور انصاف پر آمادہ کرنے، اس سے قوانین اسلام اور احکام شریعت کا اجرا کرانے اور اس کے ہاتھوں سے منکرات و بدعات کا سدباب کرانے والے صلحاً و مشائخ جنھوں نے اپنے ذوق عبادت اور مشغولی بحق پر اس اجتماعی مصلحت کو ترجیح دی اور بارہا اس کے لئے اپنے کو خطرے میں ڈالا، صالح انقلاب برپا کرنے اور صحیح بنیادوں پر اسلامی حکومت کے قیام کے لئے ذہنوں کو تیار اور فکری و عملی طور پر اس کے لئے اشخاص کی تربیت کا انتظام اور اس کے لئے علمی بنیادیں استوار کرنے والے اکابر علما؛ یہ سب حضرات خواہ .....کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں اور ان پر کوئی لقب غالب آگیا ہو، سب اسی راہ کے مسافر تھے، جنھوں نے اپنے اپنے وقت اور حالات میں اقامت دین کا فرض انجام دیا، صرف فرق یہ ہے کہ بعض کے حالات تاریخ کی تیز روشنی میں ہیں، اور بعض کے حالات، ان کے خیالات و عزائم، اور ان کی مساعی تاریخ کی عرفی کتابوں میں مدون نہیں ہیں، اس کے لئے ہمیں مکتوبات و ملفوظات، اور غیر مطبوعہ کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، ان کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا کہ اس مقصد کے لئے ہر زمانہ

میں اپنے موجود و محدود وسائل کے ساتھ کوشش بھی کی گئی، اور ہر دور میں علمائے حق نے اس سلسلہ میں اپنا فرض ادا کیا، اور انھوں نے اپنے خدا کو راضی اور ضمیر کو مطمئن کیا، بلکہ ان میں سے متعدد اصحاب عزیمت نے اس کام کو اس منزل تک بھی پہونچا دیا جس سے کام کرنے والی برصغیر اور ممالک اسلامیہ کی وہ جماعتیں جو اس نام یا اس نام کے بغیر کام کر رہی ہیں، ابھی بہت دور ہیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا وہ اس منزل تک پہونچیں گی بھی یا نہیں۔

جہاں تک حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقائے صادقین کا تعلق ہے، انھوں نے اس مقصد کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں اور قوتیں صرف کر دیں اور حصول مقصد کے کسی ذریعہ سے جو اس میں کچھ بھی مفید ہو سکتا تھا، انھوں نے دریغ نہیں کیا اور بالآخر جان، جانِ آفریں کے سپرد کر کے وہ سرخ رو ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اسی گروہ کو سامنے رکھ کر حسب ذیل اشعار کہے ہیں۔

تکیہ بر حجت و اعجاز بیاں نیز کنند کار حق گاہ بشمشیر و سناں نیز کنند
گاہ باشد کہ تہِ خرقہ زرہ می پوشند عاشقاں بندۂ حال اند و چناں نیز کنند
چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند او را وز ہماں آب و گل ایجاد جہاں نیز کنند
ہمہ سرمایۂ خود را بنگاہے بدہند ایں چہ قومیست کہ سودا بزیاں نیز کنند[1]

---

[1] زبورِ عجم۔

آخری گذارش

ہماری یہ معروضات جو دینی حقائق و مقاصد کی تشریح و تفہیم کے سلسلہ میں چند ضروری "تنقیحات" کی حیثیت رکھتی ہیں، شاید ان حضرات کی طبیعت و ذوق پر گراں گزریں جو اصولی "اختلاف" اور ذاتی مخالفت کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کے عادی نہیں، اور وہ دین کے کسی داعی و خادم اور کسی ایسی تحریک و دعوت کے قائد کی (جس سے کسی قسم کا دینی، ملی یا سیاسی فائدہ پہونچ رہا ہو) کسی تحقیق یا نقطۂ نظر سے ادنیٰ اختلاف کو اسلامی مفاد کو نقصان پہنچانے اور اجتماعیت میں رخنہ اندازی کے مرادف سمجھتے ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات اختلاف و تردید اور اس طریق کار کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تحقیق و نقطۂ نظر کا اختلاف اور خالص دین اور مسلمانوں کے مفاد میں اس کا اظہار و اعلان نہ صرف یہ کہ سلف سے لے کر خلف تک کا شیوہ اور شعار رہا ہے، بلکہ دین کی (جزئی) تحریف سے اور ملت کے (کلی) انحراف سے محفوظ رہنے میں، اس کا بڑا دخل ہے۔

ائمۂ مجتہدین کا تو ذکر ہی کیا کہ ان پر تو نفسانیت، حسد اور معاصرت کے فتنہ کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، جن لوگوں کا شمار، زمانہ، مرتبہ، علم اور مقبولیت میں ان کے بعد ہوتا ہے، انھوں نے بھی تحقیق و نقطۂ نظر کے اس اختلاف کو نہ صرف گوارہ کیا بلکہ اس کا خیر مقدم کیا اور اس کے لئے اپنے ناقدین کے ممنون و شکر گزار ہوئے، ان کے متبعین و معتقدین نے بھی

ان کے معاصرین وہم طبقہ لوگوں کی تنقید و تحقیق کو فراخ دلی کے ساتھ قبول اور سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کیا، بلکہ ان کے بعد کے آنے والوں کی تنقید و تحقیق کو بھی درخورِ اعتنا و لائق توجہ سمجھا' اور ان پر کسی ذاتی غرض یا اسلامی مفاد کو نقصان پہنچانے کا الزام نہیں لگایا، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ پر ابن جوزی اور امام ابن تیمیہؒ کی تنقیدیں اور خود شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ پر ان کے ان معاصرین کی تنقیدیں جو ان کے تبحر العقول تبحر، نادرۂ روزگار ذکاوت اور غیر مشتبہ اخلاص کے قائل تھے (مثلاً علامہ ذہبی اور ابن دقیق العید وغیرہ) اس کا نمونہ ہیں، اسی طرح صوفیائے کرام میں پورے اعتراف و احترام کے ساتھ ایک کا دوسرے سے اختلاف اور بعض اوقات کسی تحقیق یا "حال" کی تردید کوئی مخفی راز نہیں ہے۔

اخلاص، سچی طلبِ حق، دین کا ہر شائبۂ تحریف سے محفوظ رہنا، اور اسلام کی سربلندی اگر پیش نظر ہو اور اس حقیقت پر راسخ عقیدہ ہو کہ صرف نبی کی ذات معصوم ہوتی ہے، "وکلٌ یوخذ من قولہ ویترك" تو ان تنقیدات یا تنقیحات سے نہ صرف یہ کہ گرانی نہیں ہونی چاہیئے بلکہ ایک طرح کی مسرت و بشاشت ہونی چاہیئے کہ دین کے فہم و تفہیم اور اسلام کی صیانت و حفاظت میں اس سے مدد ملے گی، اور یہ ثابت ہوگا کہ مطلوب و مقصود اتباعِ حق و رضاء الٰہی ہے، نہ کہ شخصیت پرستی اور سخن پروری۔

فِرق اسلامیہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان میں سے کثیر تعداد میں وہ فرقے اور گروہ ہیں جن کی بنیاد نیک نیتی، جذبۂ اصلاح یا کسی خرابی یا جمود و غلو کو دور کرنے پر پڑی تھی، اور ان کے بانیوں نے رجوع الی الحق اور کتاب و سنت کو صحت و خطا کی میزان اور حق کا معیار سمجھنے اور ماننے کی دعوت دی تھی، مگر ان کے پیروؤں کے اسی غلو اور شخصیت پرستی نے جو ان کے وفور علم، جرأت تنقید، یا ایثار و قربانی کی بنا پر ان میں پیدا

ہوگیا تھا، اور امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتا رہا، ان کو ایک فرقہ اور گروہ بننے کے راستہ پر ڈال دیا اور سواد امت سے وہ بتدریج دور، علمائے وقت اور صالحین سے بدگمان وشاکی اور ان سے استفادہ کرنے کے جذبہ اور صلاحیت سے محروم ہوتے چلے گئے۔

یہ صورت حال اس جماعت کے ساتھ زیادہ پیش آتی ہے اور اس کا خطرہ رہتا ہے جس کا فکری وعلمی اٹھان، نشو ونما اور ذہنی ارتقا ایک ہی شخصیت کے افکار وخیالات اور تحقیقات پر ہوا ہو، اور اس کی ذہنی ودینی تربیت میں کوئی اور موثر عنصر، شخصیت یا ادارہ شامل نہ رہا ہو، پھر کچھ اس بانیٔ جماعت وداعی کی تحریروں سے (جو پیش رو علماء واہل فکر کی تنقید اور جماعتوں کے احتساب کے لئے لکھی گئی ہیں) یا اس کے معتقدین و متبعین کی مبالغہ آمیز اور پرجوش تلقین ودعوت اور حمایت ونصرت سے جس کے اندر دوسرے صحیح الخیال، راسخ العلم علماء، داعیوں اور خادمان اسلام کے کارنامہ کی (جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اسلام کی کوئی جلیل القدر خدمت انجام دی، کسی عظیم فتنہ کا سدِ باب کیا، یا ان سے اسلام کی وسیع تبلیغ واشاعت، نفوس وقلوب کا تزکیہ واصلاح اور دلوں کی مسیحائی کا کام انجام پایا) دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر نفی اور اکثر تحقیر وتنقیص شامل ہو گئی، اس جماعت کا ذہنی وعلمی رشتہ جماعت سے باہر کے اہل اخلاص، اور اہل خیر سے جن سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، کمزور ہوتے ہوتے منقطع ہوگیا، اور وہ جماعت اپنے ذہنی وفکری اور اپنے بانی کے پیدا کئے ہوئے لٹریچر کے خول میں زندگی گزارنے لگی، اور اگر اس جماعت میں اسی پایہ کے یا زمانہ کی ضرورت کے مطابق دوسرے اہل فکر یا اہل قلم پیدا نہیں ہوئے، تو اس کو اپنے اس ذہنی حصار میں باہر کی تازہ ہوا، تازہ افکار، کتاب وسنت

سے براہ راست جدید استفادہ و استنباط کے عمل سے جس کو ہمیشہ جاری رہنا چاہیے، محروی ہوگئی، اور پھر یہ درخت نئے برگ و بار لانے اور باہر سے شادابی اور نمو حاصل کرنے کے بجائے مرجھانے اور سوکھنے لگا، اور جماعت اس خیر عظیم سے محروم ہوگئی، جو امت میں زمان و مکان کے حدود سے بالاتر ہو کر پھیلا دی گئی ہے، اور جس سے کوئی زمانہ، کوئی ملک اور کوئی ادارہ و جماعت (جس کی بنیاد عقائد صحیحہ اور اخلاص پر پڑی ہو) خالی نہیں، اس وسیع ذخیرۂ خیر سے محرومی اور اپنے گرد اپنے ہی ہاتھ سے کھینچے ہوئے دائرہ کے اندر محدود رہنا خود اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں۔

جماعت کے مخلص و صاحبِ علم و فکر اصحاب کو کھلے دل سے اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے اس نقطۂ نظر سے جماعت کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے، اور اس کو اس صورت حال سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ کتاب اسی دعوت غور و فکر اور احتساب نفس کی دعوت کے سلسلہ میں ایک حقیر کوشش ہے۔ "وما علینا الا البلاغ"